صہبائی کی فارسی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ

مقالۂ تحقیقی برائے پی ایچ ڈی

از

خانم زاہدہ پٹھان

اُستاد راہنما

دکتور نصیر احمد صدیقی

استاد یار، بخش فارسی

دانش گاہ اسلامی، علیگر

اپریل ۱۹۸۸ ء

T. 4146

CHECKED-2002

M. A. LIBRARY

T4146

I CERTIFY THAT THE THESIS ENTITLED "A CRITICAL STUDY OF SAHBAI'S PERSIAN WORKS" BY MRS. ZAHIDA PATHAN IS AN ORIGINAL RESEARCH WORK DONE UNDER MY SUPERVISION.

THE MATTER HAS BEEN VERY ELEGANTLY PRESENTED IN A MOST COMPREHENSIVE AND UNIFIED FORM WHICH REVEALS HER CRITICAL ABILITY, ANALYSIS AND JUDGEMENT. IN MY ESTIMATE, THE THESIS SUBMITTED HEREWITH DESERVES TO BE CONSIDERED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF PH.D. IN PERSIAN.

N. A. Siddiqi

(DR. N.A. SIDDIQI)
SUPERVISOR
Department of Persian,
M. U. Aligarh

فهرست مضامین

فہرست مضامین

۱ــ پیش گفتار ۱ ــــ ۱۰

باب اول

۲ــ جزو اول ــــ انیسوین صدی کی تہذیب و ثقافت اور
ادبی حالات ــــ ایک عمومی جائزہ ۱۱ ــــ ۳۰

۳ــ جزو دوم ــــ صہبائی کے حالات زندگی ــــ ایک مختصر تعارف ۳۱ ــــ ۵۵

۱ــ ولادت و نسب

۲ــ خاندان

۳ــ تعلیم اور اساتذہ

۴ــ دہلی کالج کی ملازمت

۵ــ علوم شرقیہ کا نصاب تعلیم

۶ــ ادبی کارنامے

۷ــ علمی و ادبی سرپرستی

۸ــ وفات

باب دوم

۴ــ صہبائی بحیثیت شاعر ۵۶ ــــ ۱۰۷

۱ــ تخلیقات شعری کا تفصیلی مطالعہ
اور کلام پر تبصرہ

۲ــ صہبائی کی شاعرانہ اہمیت

۳ــ صہبائی اور بیدل

باب سوم

۵۔ صہبائی کی نثری خدمات ـــ تنقید و تجزیہ ۱۰۸ ـــ ۱۷۴

۱۔ ہندوستان کے دورۂ متاخرین میں سبک ہندی کی روایت

۲۔ نثر نگاری میں صہبائی کا اسلوب نگارش

۳۔ ہندوستان کے روایتی اسلوب نگارش میں صہبائی کی نمایندگی ـــ خصوصی حوالوں کے ساتھ۔

باب چہارم

۶۔ صہبائی بحیثیت شرح نگار ۱۷۵ ـــ ۲۱۱

۱۔ مختلف ادبی تصانیف اور ان کی شروح۔

۲۔ صہبائی کی شروح کی ادبی و لسانی خصوصیات ـــ

۳۔ ظہوری اور صہبائی۔

باب پنجم

۶۔ اختتامیہ ۲۱۲ ـــ ۲۲۶

۷۔ فہرست منابع ۲۲۷ ـــ ۲۳۱

پیش گفتار

پیش گفتار

ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان و ادب کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور اس کی تابناک شعاعین نہ صرف سرزمین ایران بلکہ ہندوستان ، افغانستان اور ماوراالنہر کو بھی منور کررہی تھین ۔ در حقیقت یہ فارسی زبان کی شیرینی اور فارسی شعر و ادب کی ہمہ گیری تھی جس نے صرف ہندوستان کو ہی نہین بلکہ پورے ایشیا کے خواص و عوام کو متاثر کرلیا تھا ۔

ہندوستان مین فارسی زبان و ادب کا آغاز غزنوی حکمرانون کے قیام حکومت کے ساتھ ہوا ۔ غزنوی حکمرانون کی آمد ہندوستان کی سیاسی تاریخ مین ایک اہم موڑ تھا ۔ جس نے سیاسی اعتبار سے ہی نہین بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ہندوستان پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا ۔ اگر یہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا کہ فارسی شعر و ادب کو ہندوستان مین روشناس کرانے والے غزنوی بادشاہ ہی تھے ۔ محمود غزنوی نے ایران مین شعرا اور ادبا کی جو سرپرستی کی تھی وہ محتاج بیان نہین ۔ ایران کے بہت سے نامور شعرا اس کے دربار سے وابستہ رہے تھے ۔ شاہانہ سرپرستی اور شعر و ادب کا یہ ماحول اب ایران کے ساتھ ہندوستان مین بھی قائم ہونا شروع ہوگیا تھا

غزنوی حکمرانون کے بعد شہاب الدین غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ ۶۰۲ ھ مین قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے ساتھ ہی فارسی زبان کو علمی و درباری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا ۔ اس کے بعد خلجی اور تغلق خاندانون کو عروج حاصل ہوا ۔ جیسے جیسے مسلم حکمرانون کو استحکام نصیب ہوتا گیا ، بیرونی ممالک سے شعرا ، علما اور فضلا ہندوستان آکر اقامت گزین ہوتے گئے ۔ اس کی ایک اور وجہ ایران کے ناسازگار سیاسی حالات بھی تھے ۔ اس وقت ایران کے درباروں مین سیاسی انتشار

کے سبب وہ علمی و ادبی فضا قائم نہ رہ سکی تھی جو اس سے قبل ایران کے درباروں میں نظر آتی تھی ۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں علم و ادب کی فضا سازگار ہوگئی تھی اور ہندوستان کے درباروں کا علمی و ادبی ماحول اور بادشاہوں اور امرا کی داد و دہش کی کشش نے ایران کے اہل علم و فن کو ہندوستان آنے پر مجبور کر دیا تھا ۔

مسلمان حکمرانوں کی آمد اور انکی تہذیب و تمدن نیز زبان و افکار ، اگر ایک طرف مقامی لوگوں پر اثر انداز ہوئے تو دوسری طرف باہمی امتزاج سے فارسی زبان و ادب میں بھی مقامی رنگ کی آمیزش شروع ہوگئی ۔ (یہی وہ وقت تھا جب اردو زبان کے لئے زمینہ تیار ہورہا تھا) اور اس کے تحت جو ذخیرۂ علم و ادب وجود میں آیا وہ "سبک ہندی" کے نام سے مشہور ہوا ۔ مختصر یہ کہ غزنوی حکومت سے لے کر مغلیہ سلطنت کے استحکام تک کئی حکومتوں کو عروج و زوال ہوا لیکن فارسی زبان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ روز افزوں وہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتی گئی یہاں تک کہ دور مغلیہ میں وہ منتہائے عروج پر پہنچ گئی تھی چنانچہ مغلیہ دور حکومت سیاسی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ شعر و ادب کے اعتبار سے بھی " دور زرین " کہلانے کا مستحق ہے ۔ اس وقت فارسی شعر و ادب کو جو ترقی ہندوستان میں ہوئی وہ ایران میں بھی نظر نہیں آتی ۔ اگر اس کی ایک وجہ شاہان مغلیہ کی سرپرستی اور ہنر شناسی نیز امرا اور شہزادگان کی علم دوستی اور ادب پروری تھی تو دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اب سرزمین ایران علمی اور ادبی اعتبار سے روز بروز گذشتہ سے محروم ہوچکی تھی اور وہاں اب شعر و ادب کا وہ ماحول نہ رہا تھا جو اس سے قبل ایران میں نظر آتا تھا ۔ لہذا ایران کے شعرا و ادبا اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آنے پر مجبور ہوگئے ۔ خاص طور پر اکبری دور میں ان مشہور شعرا و ادبا کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس وقت ہندوستان فارسی زبان و ادبیات کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جانے لگا تھا ۔ ان مشاہیر شعرا و

نثر نگارون مین ایک بڑی تعداد ایران سے آنے والے شعرا کی تھی تو چند ایسے بھی تھے جنھون نے ہندوستان کے ادبی ماحول مین آنکھ کھولی تھی ۔ اس طرح ان کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی تھی ۔ ہندوستان مین فارسی زبان کے آغاز سے مغلیہ دور تک چند مشہور و معروف فارسی شعرا اور نثر نگارون کے نام دئے جا رہے ہین ۔ سدید الدین محمد عوفی ، منہاج سراج جوزجانی ، حسن نظامی نیشاپوری ، مسعود سعد سلمان ، شہاب مہمرہ ، امیر خسرو ، حسن دہلوی ، جمالی دہلوی ، بدر چاچ ، مظہر کڑا ، ضیاءالدین برنی ، قدسی ، فیضی ، غزالی ، خان خانان ، ابوالفضل ، عرفی ، نظیری ، ظہوری ، صائب ، طالب آملی ، ابوطالب کلیم ، مرزا عبدالقادر بیدل ، نعمت خان عالی ، ناصر علی سرہندی وغیرہ ۔

فطرت کے اصول کے مطابق کوئی چیز ہمیشہ یکسان نہین رہتی ۔ ہر وہ چیز جس کو عروج نصیب ہوتا ہے ایک نہ ایک دن زوال بھی اس کا مقدر بنتا ہے ۔ اس اصول (فطری کلیہ) کے تحت جس طرح حکومتون کو عروج و زوال ہوتا رہتا ہے ، بالکل اسی طرح زبان و ادب کو بھی تغیر و تحول کے مرحلون سے گزرنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ ہندوستان مین فارسی زبان و ادب بھی نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد زوال کی طرف مائل ہونا شروع ہوا ۔ یعنی سلاطین تیموریہ کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب مین بھی بتدریج تنزل کے آثار نمایان ہونے لگے ۔ خاص طور سے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے بعد اس کی رفتار تیز ہوگئی تاہم اس زوال پذیر دور مین بھی کچھ اہل علم و ارباب ذوق ایسے موجود تھے جو ناسازگاریٔ حالات کے باوجود نہ صرف فارسی زبان و ادب کے دامن سے وابستہ رہے اور فارسی زبان و ادب کی بزم آراستہ کرتے رہے بلکہ فارسی زبان و ادب کو قعر گمنامی مین گرنے سے بچانے کی کوششین بھی دل و جان سے کرتے رہے ۔ بالفاظ دیگر اٹھارھوین صدی کے اواخر اور انیسوین صدی عیسوی

کے آغاز میں فارسی زبان و ادب کا چرچا اہل علم میں باقی تھا اور ہنوز فارسی زبان میں شعر و شاعری اور نثر نگاری کی روایت برقرار تھی یعنی اس وقت تک فارسی زبان کو علمی و ادبی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا ۔ یہاں تک کہ جب مغلیہ سلطنت کا آخری حکمران سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت و آن بان کا بوجھ اپنے ناتوان اور ضعیف کندھوں پر اٹھائے ہوئے سنبھلنے کی ناکام کوشش کررہا تھا ، اس وقت بھی فارسی زبان و ادب کی مقبولیت اہل علم و دانش میں برقرار تھی ۔ اگرچہ اس وقت تک عوام کی زبان اردو بن چکی تھی اور بیشتر شعرا و ادبا اردو زبان میں ہی طبع آزمائی کررہے تھے جس کے نتیجے میں تیزی سے اردو زبان میں سرمایۂ شعر و ادب وجود میں آنے لگا تھا اس کے باوجود بیشتر شعرا اور نثر نگار ایسے بھی تھے جو فارسی زبان میں علمی و ادبی تخلیقات پیش کرنا اپنے لئے باعث فخر و امتیاز سمجھتے تھے ۔ یہی سبب تھا کہ اس زمانے میں دوللسانین شعرا کی تعداد کافی تھی ۔ ایسے شعرا کی فہرست میں غالب ، مومن ، آزردہ و شیفتہ وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں ۔ غالب کی شہرت اگرچہ ان کے اردو کلام کی وجہ سے زیادہ ہے لیکن خود ان کو اپنے فارسی کلام پر ناز تھا اور وہ اپنے فارسی کلام کو " نقش ہائے رنگ رنگ " سے تعبیر کرتے تھے ۔

مولانا امام بخش صہبائی کا شمار بھی اس دور کے مشہور شعرا و ادبا میں ہوتا تھا ۔ صہبائی نے جس وقت ہوش سنبھالا اس وقت فارسی زبان کا عہد شباب گزر چکا تھا اور وہ مغلیہ سلطنت کے ساتھ ساتھ زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی ۔ یہ وہ وقت تھا جب اہل علم کا ایک گروہ فارسی زبان کی روایت کو قائم رکھنے اور اس کی بقا کے لئے جد و جہد میں مصروف تھا ۔ ایسے لوگوں کی فہرست میں صہبائی کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے ۔ وہ اپنے وقت کے فارسی گو

قادرالکلام استاد سمجھے جاتے تھے ۔ ان کی اہمیت اور انفرادیت میں اضافہ ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی مقبولیت کے باوجود ، وہ تنہا ایسے شاعر اور انشاپرداز تھے جو صرف فارسی زبان میں ہی شعری اور نثری تخلیقات پیش کررہے تھے ۔ اور اس طرح فارسی زبان و ادب کے گرتے ہوئے ستون کو سہارا دینے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نگارشات علمی و ادبی فارسی زبان میں ہی پائی جاتی ہیں ۔ جبکہ اردو زبان میں ان کی تصانیف معدودے چند ہی ہیں جو انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل کی خواہش پر لکھی تھیں ۔

بدقسمتی سے صہبائی جیسے اہم اور اعلی مرتبت شاعر اور نثر نگار ادیب ابھی تک فارسی علم و ادب کی دنیا میں پوری طرح روشناس نہیں ہوسکے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں ، جو انھوں نے فارسی ادب میں انجام دئے تھے ، ان کو ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کے وہ مستحق تھے ۔ میرا پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ اسی مقصد کے تحت لکھا گیا ہے تاکہ فی الجملہ ان کی فارسی کی شعری و نثری تخلیقات کا جائزہ لیا جاسکے ۔ نیز فارسی زبان و ادب میں ان کو جائز و مناسب مقام دلوانے میں معاون بن سکے ۔

ایک مقالے میں صہبائی کی فارسی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لینا " دریا " کو " کوزہ " میں بند کرنے کے مترادف ہے ۔ موضوع کی وسعت و گہرائی مزید تفصیل کا مطالبہ کرتی ہے ۔ راقم الحروف نے ایک تحقیق کے طالب علم کی حیثیت سے ، اس مقالے کی ترتیب میں حتی الوسع یہ کوشش کی ہے کہ مطالب کی ادائیگی میں تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جاسکے ۔ راقم الحروف کو اپنے اس مقصد ، اور کوشش میں کس حد تک کامیابی مل سکی ہے اس کا

فیصلہ تو ممتحین حضرات کی قیمتی اور قابل قدر رائے ہی کرسکتی ہے۔

مقالے کے باب اول کے پہلے جزو میں صہبائی کے زمانے یعنی انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی حالات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ زمانہ مغلیہ سلطنت کا دور زوال تھا، ساتھ ہی شعر و ادب کے گلشن سے بہار رخصت ہوچکی تھی اس کے باوجود چند اہل ذوق حضرات اور خود بادشاہ شعر و ادب کی سابق روایت کو برقرار رکھنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔ چنانچہ اس دور میں بھی چند ایسے فارسی شعرا اور نثر نگاروں کے نام ملتے ہیں جن سے فارسی زبان و ادب کا نام ہندوستان میں باقی اور زندہ تھا۔ ایسے شعرا کی فہرست میں غالب کے بعد صہبائی کا نام آتا ہے۔ صہبائی فارسی زبان و ادب کے ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے اور ان کا شمار اپنے عہد کے مشہور و معروف فارسی دانوں میں ہوتا تھا۔

باب اول کے دوسرے جزو میں صہبائی اور ان کی شخصیت کا مختصراً تعارف اور ان کے حالات زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات، وطن، دہلی کالج کی سروس، کیریر اور ان کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

مقالے کے دوسرے باب "صہبائی بحثیت شاعر" میں ان کے فارسی کلام کا تفصیلی مطالعہ اور ان کی خصوصیات شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ صہبائی کی شاعری "سبک ہندی" کی خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ سبک ہندی کے آخری بڑے نمایندہ شاعر یعنی بیدل کے مقلد اور پیرو تھے۔ ابتدا میں غالب کی شاعری میں بھی بیدلانہ رنگ پایا جاتا تھا لیکن جلد ہی انھوں نے اپنا راستہ بدل دیا تھا۔ لیکن

صہبائی آخر وقت تک نہ صرف نثر نگاری بلکہ شاعری میں بھی بیدل کی تقلید کرتے رہے تھے اور "سبک ہندی" کے اسلوب نگارش کے پابند رہے تھے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ "سبک ہندی" کی روایت کو برقرار رکھنے والے وہ آخری فارسی شاعر تھے۔

اس باب کی ابتدا میں فارسی زبان کے مشہور اسالیب یعنی "سبک خراسانی" "سبک عراقی" بالخصوص "سبک ہندی" کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے "سبک ہندی" کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد ان خصوصیات کی روشنی میں صہبائی کی فارسی شاعری پر مجملاً تبصرہ کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر صہبائی ایک انشا پرداز اور نثر نگار تھے لیکن اپنے زمانے کے ادبی ماحول اور شعر و شاعری کی روایت سے مجبور ہوکر یا تفریح طبع کے لئے کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثری نگارشات کو دیکھتے ہوئے ان کا دیوان بہت مختصر ہے۔ اگرچہ دیوان میں قصائد، رباعیات بلکہ غزلیات کی بھی تعداد بہت کم ہے پھر بھی ادبی اعتبار سے وہ اہم اور قابل توجہ ہے۔ "سبک ہندی" کے نمایندہ شاعر اور نثر نگار ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں سبک ہندی کی بنیادی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں سادہ، بامعنی اور دلنشین اشعار کی کمی نہیں ہے۔

آخر میں سبک ہندی کے آخری عظیم شاعر یعنی بیدل کے کلام سے مشابہت اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے تیسرے باب کا عنوان ہے "صہبائی کی نثری خدمات ــــ تنقید و تجزیہ" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس باب میں ایک انشا پرداز کی حیثیت سے ان کا تعارف کرنے کے بعد، ان کی نثری نگارشات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جیسا کہ

قبلاً عرض کیا گیا کہ ایک شاعر سے زیادہ ایک انشا پرداز اور نثر نگار کی حیثیت سے ان کا مقام بہت اونچا تھا ۔ اس باب میں ان کی نثر اور انشا پردازی کی خصوصیات، ان کے نثری کارنامے، اس زمانے کا روایتی اسلوب نگارش، فارسی اساتذہ کے شعر و نثری کارناموں کا ان کا وسیع مطالعہ، نیز قواعد، صنائع بدائع اور فن بلاغت پر ان کی گہری نظر اور اپنی نگارشات میں ان کا خوبصورت استعمال، فی الجملہ ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے ۔

اس کے علاوہ علحدہ علحدہ ان کی نثری نگارشات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے تاکہ مجموعی طور پر ان کے علم و فضل پر روشنی ڈالی جاسکے ۔ ان کی نثری نگارشات میں چند رسالے نہایت اہم اور قابل توجہ ہیں جن میں انھوں نے فارسی زبان و ادب میں اپنی بے پایاں معلومات اور علمیت کا اظہار کیا ہے ۔

اپنی نثری تصانیف میں انھوں نے سبک ہندی کے دو نمایندہ نثر نگار یعنی ظہوری اور بیدل کی تقلید کی ہے ۔ نہ صرف اسلوب کے اعتبار سے بلکہ کہیں کہیں مضمون کے اعتبار سے بھی ان میں مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کی طرح ان کی نثری تصانیف میں بھی "سبک ہندی" کی خصوصیات جیسے مضمون آفرینی، معنی آفرینی، تشبیہ، مبالغہ اور دوسری صنعتوں کا استعمال بدرجہ اتم موجود ہے ۔ اور ان کی نثری نگارشات میں سبک ہندی کے نمایندہ نثر نگار ظہوری اور بیدل کے اسلوب نگارش کی جھلک صاف نظر آتی ہے ۔

باب چہارم کا عنوان ہے "صہبائی بحیثیت شرح نگار" اس باب میں ایک شارح کی حیثیت سے ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ صہبائی صرف شاعر اور نثر نگار ہی نہ تھے بلکہ میدان ادب میں انھوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ

چنا تھا اور وہ تھا شرح نویسی کا ۔ شرح نگاری کوئی آسان اور معمولی بات نہ تھی اس زمانے کے فارسی شاعکار بالخصوص جو سبک ہندی" کے نمایندہ شاعکار بھی ہون ان کو انتخاب کرنا اور ان کی شرح لکھنا ایسا دشوار کام تھا جس کے بارے مین ایک معمولی استعداد اور علمیت رکھنے والا شخص کبھی سوچ بھی نہین سکتا ۔ جیسا کہ قبلاً کہا جاچکا ہے " سبک ہندی " مشکل پسندی ، دقت آفرینی ، ایہام و مبالغے پر مشتمل مرصع و مسجع طرز تحریر کا نام ہے ۔ اس قسم کی تحریرون کو سمجھنا ایک عام قاری یا ایک طالب علم کے اختیار کی بات نہ تھی ۔ ایک استاد ہونے کی حیثیت سے انھین اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا ۔ نیز آنے والے دور مین فارسی زبان کی مقبولیت مین روز افزون کمی اور تنزل کو ان کی باریک بین نگاہون نے اچھی طرح دیکھا اور سمجھ لیا تھا ۔ لہذا طلبا اور فارسی کے شائقین کی آسانی کے لئے انھون نے " سبک ہندی " کے چند شاعکارون کا ، جو اس زمانے مین انتہائی مقبول و معروف اور نصاب تعلیم مین شامل تھے ، انتخاب کیا اور ان کی شرح لکھی ۔ فارسی زبان و ادب مین اتنی غیر معمولی علمیت اور قابلیت کے سبب وہ اس مشکل کام سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ۔ اس باب مین فن شرح نویسی اور اس فن مین ان کے چند کارنامون پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے ۔

مقالے کے آخری باب مین ، اردو زبان مین ان کی چند تصانیف کا مجملاً ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے مین ان کے ہم عصر شعرا حضرات یا موجودہ اہل قلم حضرات کی آراء پیش کی گئی ہین اور اس کی روشنی مین فارسی علم و ادب مین ان کا مقام و مرتبہ کتنا اونچا تھا ، اس پر اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس باب مین ان کی شخصیت و علم و فضل کا بطور مجموعی نیز اختصار کے ساتھ جائزہ

لیا گیا ہے۔

میں اپنے سپروائزر ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی کی بے حد سپاس گزار ہوں جن کی رہنمائی میں میرا یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میں صدر شعبہ، پروفیسر سمیع الدین احمد صاحب کی خاص طور ممنون ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

آخر میں مولانا آزاد لائبریری کے اردو و فارسی سیکشن کے اراکین اور مستقیم احمد کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کے تعاون سے یہ مقالہ مکمل ہوکر موجودہ شکل میں آسکا۔

زاہدہ پٹھان
ریسرچ اسکالر،
شعبۂ فارسی
دانشگاہ اسلامی، علیگڑھ

۱۲۔اپریل ۱۹۸۸ء

باب اول

جزو اول ـــــ انیسوین صدی کی تہذیب و ثقافت اور
ادبی حالات ـــــ ایک عمومی جائزہ

جزو دوم ـــــ صہبائی کے حالات زندگی ـــــ ایک مختصر تعارف

۱ـ ولادت و نسب
۲ـ خاندان
۳ـ تعلیم اور اساتذہ
٤ـ دہلی کالج کی ملازمت
٥ـ اردو مین شرقیہ کا نصاب تعلیم
٦ـ ادبی کارنامے
۷ـ علمی و ادبی سرپرستی
۸ـ وفات

انیسوین صدی کی تہذیب و ثقافت اور ادبی حالات

ایک عمومی جائزہ

انیسوین صدی عیسوی مین ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی حالت اور ادبی ماحول کے بارے مین تفصیل جاننے سے قبل ضروری ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرسری طور پر جائزہ لے لیا جائے کیونکہ ہر دور کا تہذیبی اور ادبی ماحول بہت کچھ سیاسی حالات پر منحصر ہوتا ہے ۔ انیسوین صدی اور اس سے قبل کی تاریخی اور سیاسی تبدیلیون نے اس زمانے کی تہذیب و تمدن اور ادب پر بہت کچھ اثر ڈالا تھا جیسا کہ اس دور کی تاریخ کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ۔

اورنگ زیب مغل سلطنت کا آخری بڑا حکمران تھا ۔ اس کی حکومت کابل سے مدراس اور ہگلی سے سورت تک پھیلی ہوئی تھی ۔ تقریباً پورا ہندوستان اس کی سلطنت مین شامل ہوگیا تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنی عظیم الشان سلطنت اس سے قبل ہندوستان کی تاریخ مین کبھی قائم نہین ہوئی تھی ۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ سترھوین صدی دور مغلیہ کا منتہائے عروج تھا ۔ لیکن اٹھارھوین صدی کا آغاز اور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے ساتھ سلطنت مغلیہ کے زوال کا آغاز ہوگیا ۔ اس کی موت کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان ٹکڑون مین تقسیم ہوگیا ۔ سکھ ، مرھٹے اور جاٹون نے اپنی الگ الگ ریاست قائم کرلی اور اس طرح مغل بادشاہون کی وسیع و عریض سلطنت اور اس کی شان و شوکت ان کے جانشینون کی بے راہ روی اور عیش پرستی کی نذر ہوگئی ۔ مغلیہ سلطنت کا زوال سیاسی ، سماجی اور اقتصادی انقلاب کا پیش خیمہ تھا ۔

دراصل اورنگ زیب کی وفات کے بعد پچاس سال کے اندر نااہل جانشینوں کی عیش پرستی ، خانہ جنگی ، امراء کی باہمی چشمک اور فوجی طاقت میں کمی نے ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کو کمزور سے کمزور تر کر دیا تھا ۔ ادھر سولویں صدی عیسوی سے مغربی طاقتیں ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوچکی تھیں ۔ ان مغربی طاقتوں میں انگریز ، فرانسیسی اور ڈچ قومیں تھیں جو تجارت کا سہارا لے کر ہندوستان میں اپنے قدم جما چکی تھیں ۔ جب ہندوستان مختلف حصوں میں تقسیم ہوگیا اور سکھ ، مرہٹے اور جاٹوں نے اپنی اپنی الگ ریاست قائم کرلی تو ان مغربی طاقتوں کو موقع مل گیا کہ وہ ہندوستان کے حکمران جاگیرداروں کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جائیں ۔ ان مغربی طاقتوں میں انگریز قوم اپنی ذہانت ، دور اندیشی اور سیاسی تدبیروں سے اپنا اقتدار بڑھاتی رہی اور بتدریج ہندوستانیوں پر غلبہ حاصل کرتی گئی یہاں تک کہ ایک روز ایسا بھی آیا جب ہندوستان پر ان کی حکمرانی ہوگئی ۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا معظم اس کا جانشین بنا اور بہادر شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا ۔ بہادر شاہ کی مدت حکومت صرف چار سال تھی ۔ اس کی وفات کے بعد جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا ۔ جہاندار شاہ صرف شراب کا ہی شوقین نہ تھا بلکہ انتہائی ناپسندیدہ اور بری عادتوں کا مالک بھی تھا ۔ اس کی بے راہ روی ، فضول خرچی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے گیارہ مہینے کے اندر اندر شاہی خزانہ کافی حد تک خالی ہوگیا ۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہ کی ناشایستہ اور فحش حرکتیں معاشرے میں گندگی اور گراوٹ کا سبب بن گئیں اور سماج میں اخلاقی قدروں کی وہ اہمیت اور وقعت نہ رہی جو اس سے قبل نظر آتی ہے ۔ بادشاہ اپنے کردار کی کمزوری

کی وجہ سے رعایا کی نظرون سے گر گیا اور ۱۷۱۳ء مین اس کو قتل کر دیا گیا ۔
اس کے بعد سادات بارہ کی مدد سے فرخ سیر تخت پر بیٹھا ۔ یہ بھی نااہل اور
کمزور حکمران ثابت ہوا چنانچہ اسے اندھا کرکے ۱۷۱۹ء مین قتل کر دیا گیا ۔

مختصر یہ کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی بادشاہ بھی اپنے بزرگون کی
شان و شوکت ، کردار کی پختگی اور ان کی پر وقار روایات کو برقرار نہ رکھ سکا
اس کے برخلاف جو بھی تخت شاہی پر بیٹھا وہ اپنے بزرگون کی قائم کی ہوئی شاندار
سلطنت کے زوال پذیر ہونے مین مددگار ثابت ہوا اور خود کو نااہل اور کمزور
ثابت کرنے مین دوسرون سے بازی لے گیا ۔

فرخ سیر کے دور حکومت کا ایک اہم اور تاریخ ساز واقعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا
ہندوستان مین قائم ہونا تھا ۔ ۱۷۱۵ء مین ایسٹ انڈیا کمپنی کا ولیم ہملٹن کی
قیادت مین ایک وفد ہندوستان آیا جس کا مقصد ہندوستان مین تجارتی مراعات حاصل
کرنا تھین ۔ اتفاق سے اس وقت بادشاہ بیمار تھا ۔ ہملٹن نے علاج کیا اور اس کے
علاج سے بادشاہ تندرست ہوگیا ۔ بادشاہ نے خوش ہوکر ایسٹ انڈیا کمپنی کو
کلکتہ ، حیدرآباد اور مدراس مین بغیر محصول ادا کئے تجارت کے حقوق دے دئے ۔
بادشاہ کی دی ہوئی یہ اجازت اور مراعات آگے چل کر پوری ہندوستانی قوم کے لئے
کتنی نقصان دہ ثابت ہوئین اس کا اندازہ بعد کے واقعات سے بخوبی ہوجاتا ہے ۔
اس بہانے انھون نے اپنے قدم ہندوستان مین جما لئے تھے اور اس کے بعد اپنی ذہانت ،
تدبر اور دور اندیشی سے وہ روز بروز استحکام حاصل کرتے چلے گئے ۔ ہندوستان کے
اس وقت کے حالات ان کے مددگار ثابت ہوئے ۔ غرض یہ کہ فرخ سیر کے بعد شاہجہان ثانی
اور اس کے بعد محمد شاہ رنگیلا کے ہاتھون پورے ہندوستان مین پھیلی ہوئی

شاندار مغلیہ سلطنت رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتی گئی ۔ مغل حکمرانون کی تعیش پسندی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ ان کے دربار کے امرا کی سازشین اور خانہ جنگی بھی مغلیہ سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی ۔ بالآخر محمد شاہ کی رنگ رلیان رنگ لائین ۔ ایک طرف وہ عیش و عشرت کے نشے مین چور زندگی کی آسائیشون سے لطف اندوز ہورہا تھا اور دوسری طرف اس کے آبا و اجداد کی تعمیر شدہ عالیشان مغلیہ سلطنت تیزی کے ساتھ تنزل کی راہ پر گامزن تھی ۔ امرا کی جھوٹی تعریف ، خوشامدانہ باتون اور حکومت کے نشے نے اس کی آنکھون پر پردے ڈال دئے تھے ۔ اس روبہ زوال سلطنت کی تباہی مین اس کے امرا کا بڑا ہاتھ تھا ۔ محمد شاہ کے عہد مین اس کے دربار کے امرا جیسے حسین علی خان ، عبداللہ خان ، ذوالفقار خان اور سعادت خان وغیرہ نے اقتدار کی ہوس اور آپس کی خانہ جنگیون کی بدولت دارالسلطنت کو سازشون اور خانہ جنگیون کا مرکز بنادیا ۔ اقتدار کی ہوس نے ان کو اندھا کردیا تھا ۔ اقتدار کی خواہش اور جاہ و منصب کی تمنا مین وہ بڑے سے بڑا ایسا کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتے جو بادشاہ اور سلطنت کے لئے نقصان دہ ہوتا لہذا ذاتی مفاد کے لئے انھون نے وہ کام کئے جو عوام اور حکومت کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوئے اور جس کے نتیجے مین معاشرہ بدنظمی اور انتشار کا شکار ہوگیا ۔ مغلیہ سلطنت مین مدت سے قائم شدہ قومی یکجہتی ، اتحاد اور تعاون بتدریج ختم ہوتا گیا اور حکومت کو کمزور دیکھ کر بیرونی طاقتین حملہ آور ہونے لگین ۔ نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے شروع کردئے ۔ خاص طور سے ۱۷۳۸ء مین نادر شاہ کے حملے نے محمد شاہ کی حکومت کو بے حد کمزور کردیا ۔ اس وقت کے سیاسی انتشار اور امرا کی سازشون اور غداری نے اس کی حکومت کو کتنا نقصان پہنچایا اس

بات کا ثبوت وہ واقعہ ہے جو محمد شاہ کے دور حکومت مین پیش آیا یعنی جب آصف جاہ نظام الملک نے نادر شاہ سے معاہدہ کرکے یہ طے کرلیا کہ وہ (نادر شاہ) محمد شاہ کی شاہی حیثیت کو برقرار رکھے گا اور دو کڑور روپیے لے کر واپس چلا جائے گا تو اس وقت برہان الملک سعادت خان نے محض ذاتی مفاد اور روشن مستقبل کی امید مین نادر شاہ کو دہلی تک چلنے اور مزید دولت حاصل کرنے پر آمادہ کرلیا ۔ اگر سعادت خان نادر شاہ کو دہلی آنے کی دعوت نہ دیتا اور یہ غداری نہ کرتا تو دہلی اس ہولناک تباہی سے بچ جاتی جس کے نتیجے مین ڈیڑھ لاکھ جانین ضایع ہوئین اور دہلی کے عوام معاشی بدحالی کا شکار ہوئے ۔

۱۷۴۸ء مین محمد شاہ کی وفات کے بعد ہندوستان مختلف صوبون اور علاقون مین تقسیم ہوچکا تھا جن پر خود مختار حکمران حکمرانی کررہے تھے اور مرکزی حکومت اب محض دوآبۂ گنگ و جمن تک محدود ہوکر رہ گئی تھی ۔ محمد شاہ کی وفات سے تقریباً تین مہینے پہلے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوگئے تھے اگرچہ پہلے حملے مین اسے شکست ہوگئی تھی لیکن بعد کے یکے بعد دیگرے حملون مین کشمیر ، پنجاب اور ملتان اس کے قبضے مین آگئے تھے ۔ مختصر یہ کہ ۱۷۵۷ء مین پلاسی کی جنگ نے بنگال مین انگریزون کو حاکم بنا دیا تھا اور اس کے بعد ۱۷۹۹ء مین ٹیپو سلطان کی شکست نے انگریزون کے حوصلے اور بلند کردئے تھے یعنی اب بنگال اور دکن پر انگریزون کا قبضہ ہوچکا تھا یہان تک کہ ۱۸۰۳ء یعنی انیسوین صدی کے آغاز مین لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کرکے شاہ عالم کو گرفتار کرلیا اور ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق شاہ عالم کی حکومت قلعہ و اطراف دہلی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی ۔ امرا اور وزراء اپنے فرائض سے غافل اور اپنے اقتدار کے لئے برسرپیکار ہوگئے ۔ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ امرا کے ہاتھون اس کی حیثیت

محض ایک کٹھ پتلی کی سی تھی ۔ دوسری طرف جاگیردارانہ اور منصب دارانہ نظام حکومت کی خرابیاں معاشرے میں داخل ہوتی گئیں اور معاشرے میں ان کا نفوذ اس حد تک ہوگیا کہ عوام کی زندگی میں بدحالی اور بے اطمینانی پیدا ہوگئی ۔ سلطنت مغلیہ کو جب مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اس کا دور عروج تھا اس وقت ہندوستان میں صرف سیاسی اتحاد ہی قائم نہ تھا بلکہ تہذیبی ہم آہنگی بھی تھی جس نے سیاسی و تہذیبی اعتبار سے ہندوستانی معاشرے کو خوشحالی اور بے فکری بخشی تھی جو عظیم تخلیقی و فکری کارناموں کے وجود میں آنے کا سبب بنی ۔

مرکزی حکومت کے اختتام کے ساتھ قومی اور سیاسی اتحاد اور معاشرے کی خوشحالی بھی ختم ہوگئی تھی اس لئے عوام ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے شراب کا سہارا لیتے یا اپنی قسمت اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے بیروں اور فقیروں کے در کے چکر لگاتے ۔ دراصل عدم تحفظ اور بے اطمینانی کے احساس نے معاشرے میں قنوطیت ..... طاری کر دی تھی چنانچہ عوام اس قنوطیت کو دور کرنے اور اپنی بدحالی کے احساس اور حالات کی کشمکش کو بھلانے کے لئے جام و سبو سے دل بہلانے لگے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں شراب نوشی اور پیروں سے عقیدت مندی دونوں چیزیں عام تھیں ۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ، جب انگریزوں نے مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی پر حملہ کرکے شاہ عالم سے ایک معاہدہ کرلیا جس کے تحت بادشاہ کی حکومت دہلی اور اس کے اطراف تک محدود ہوگئی اور ہر چیز پر انگریزوں کی حکمرانی ہوگئی ، اس وقت کی اس سیاسی تبدیلی سے مدت سے چلی آرہی خانہ جنگی اور انتشار بھی ختم ہوگیا ۔ انگریزوں کی حکمرانی کے ساتھ بالکل

غیر متوقع طور پر ملک میں امن قائم ہوگیا تھا ۔ انھوں نے پورے ملک بالخصوص دہلی کی خوشحالی بڑھانے کی کوشش کی اور بہت کم مدت میں ایک بار پھر دہلی کو ایک ثقافتی ، تجارتی اور صنعتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی ۔

دراصل مغلیہ سلطنت کا زوال ہی ہندوستان میں سیاسی ، سماجی اور اقتصادی انقلاب کا پیش خیمہ تھا ۔ اس قسم کے انقلابات کو تاریخ میں بے حد اہمیت حاصل ہے کیونکہ قوم و ملک کی ترقی میں ان انقلابات کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ کسی ملک بھی ملک کی تاریخ کے مطالعے سے ان انقلابات کی اہمیت واضح طور پر نظر آتی ہے ۔ ہر ملک کی تاریخ میں انقلابات آتے رہے ہیں ۔ قوموں کو عروج و زوال ملتا رہا ہے ۔ یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے ۔ بظاہر یہ انقلابات سیاسی ہوتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان انقلابات کا اثر پورے معاشرے اور تہذیب و تمدن پر بھی گہرا پڑتا ہے ۔ بالفاظ دیگر سماج اور تہذیب کی تشکیل میں بالواسطہ اور بلاواسطہ ان انقلابات کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان انقلابات کا اثر جانی اور مالی نقصانات کی شکل میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ یہ انقلاب کے تخریبی عوامل ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں کچھ تعمیری عوامل بھی پوشیدہ ہوتے ہیں ۔ یہاں تعمیری عوامل سے مطلب وہ تہذیب و تمدن ہے جو حملہ آور قوم اپنے ساتھ لاتی ہے اور محکوم قوم کی تہذیب و تمدن میں امل کردیتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ حاکم قوم سماج کو کچھ نئی قدریں بھی دیتی ہے جو انسانی زندگی اور سماج کے لئے بے حد اہم ہوتی ہیں ۔ یہ قدریں شخصی اور اجتماعی زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر سماج ان نئی قدروں کو نہ اپنائے تو جمود کا شکار ہوجاتا ہے جو ایک قوم کی زندگی کے لئے بہت نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ زندگی جمود کا نہیں بلکہ حرکت کا نام ہے اور حرکت عمل سے ہوتی ہے ۔

عمل سماج یا معاشرے میں نئی قدریں اپنانے یعنی ارتقاء کا نام ہے۔ ایک قوم کی زندگی میں عمل سے مراد وہ نئی قدریں ہیں جو سماج یا معاشرہ وقت کے ساتھ اپناتا رہتا ہے۔ اس سے قوم اور معاشرے میں ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے۔ اگر یہ ارتقائی عمل رک جائے تو سماج جمود کا شکار ہوجاتا ہے۔

صدیوں قبل جب مسلمان ہندوستان میں حکمران کی حیثیت سے آئے تو انہوں نے ہندوستان کے سماج کو اپنی تہذیب اور ثقافت دی اور کچھ نئی قدریں دیں جو ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے نئی اور اجنبی تھیں لیکن بعد میں چھ سو سال تک مسلمانوں کی حکمرانی سے ان کی تہذیبی اور سماجی قدریں ہندوستان میں اس طرح رچ بس گئیں کہ وہ ہندوستان کی تہذیب اور ثقافت کا جزو بن گئیں۔ مثلاً فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک نئی زبان تشکیل پانے لگی جس نے رفتہ رفتہ موجودہ اردو کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے علاوہ لوگوں نے ایک دوسرے کے لباس کو بھی آہستہ آہستہ اپنانا شروع کیا یہانتک کہ بعض اوقات لباس سے ہندو اور مسلمان میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا۔ آداب مجلس، رہن سہن، طور طریقے، تہذیب و تمدن غرض ہر چیز پر مسلمان حملہ آوروں نے اپنا اثر ڈالا اور خود بھی اثر قبول کیا۔ یہ لین دین کا سلسلہ کچھ شعوری تھا اور کچھ غیر شعوری۔ بالکل اسی طرح جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں اور سیاسی اعتبار سے انگریزوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور ایک سیاسی انقلاب تقریباً ناگزیر ہوگیا تو رفتہ رفتہ ہندوستان کے معاشرے میں کچھ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں یعنی کچھ نئی تہذیبی اور ثقافتی قدریں ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ سب سے پہلی چیز صنعتی انقلاب تھا کیونکہ انگریز اپنے ساتھ صنعتی ترقی اور مغربی تہذیب و تمدن لائے تھے۔

اگرچہ انگریزون کی لائی ہوئی یہ تبدیلیان اٹھاروین صدی عیسوی سے ہند وستانی سماج پر اثر انداز ہورہی تھین لیکن انیسوین صدی عیسوی کی ابتدا سے ان کی رفتار تیز ہوگئی ۔ مثال کے طور پر اب ہند وستان مین بھی مشینی صنعتین متعارف ہونا شروع ہوئین اور بین الاقوامی تجارت کی اہمیت بڑھی اور اس کو فروغ حاصل ہوا یہان تک کہ چھوٹی موٹی ہاتھ سے کی جانے والی دستکاری اور صنعتین ختم ہونے لگین ۔ پرانی صنعتون کے ختم ہوجانے کی وجہ سے مزدور طبقہ وجود مین آنے لگا جو تلاش معاش مین دیہاتون کو چھوڑ کر شہری آبادی مین اضافہ کررہا تھا ۔ انگریزون نے بین الاقوامی تجارت کو بڑھایا اور سرمایہ دار طبقہ کی حیثیت حاصل کرلی ۔

انگریزون کے تسلط نے بالواسطہ اور ان کی تہذیب و تمدن نے بلاواسطہ ہند وستانیون کے خیالات اور ان کی سماجی اور ثقافتی زندگی کو متاثر کیا تھا ۔ اس سے قبل انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے ہند وستان کے لوگ آشنا نہین تھے ۔ اب انگریزون کی آمد کے ساتھ انگریزی زبان و ادب سے بھی ان کا تعارف ہوا ۔ تعلیم کا مطلب اب صرف مذہبی اور اخلاقی تعلیم نہ رہا تھا جو اس زمانے کی تعلیم کا بنیادی جزو سمجھا جاتا تھا بلکہ جدید علوم اور سائنس کے نئے انکشافات کے تحت تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے مین مذہبی اور سماجی خیالات و نظریات مین گہری تبدیلی آئی اور ہند وستانیون مین مغربی تہذیب اور مغربی زبان و ادب سے وابستگی اور شوق پیدا ہوا ۔

اس دور کی ایک خاص چیز پریس کی ایجاد ہے ۔ پریس کا استعمال شروع ہوتے ہی ہند وستانی زبانون مین کتابون ،رسالون اور اخبارون کی اشاعت عام ہوئی ۔ یہی نہین بلکہ انگریزی کے اخبار اور رسائل بھی عوام کی معلومات مین اضافے کا سبب بنے ۔

پریس اور اخبار نے عوام مین بیداری پیدا کی اور ان کے سیاسی نظریات کی تشکیل مین معاون بنے یعنی اس وقت عوام کی سیاسی بیداری مین پریس اور اخبار کا بہت بڑا رول تھا ۔

سرجادو ناتھ سرکار انگریز قوم کی دی ہوئی سہولتون کو اس طرح بیان کرتے ہین

" انگریزون نے ہندوستان کو پہلا تحفہ مکمل طور پر اندرونی امن اور ہندوستان پر بیرونی حملون سے نجات کی شکل مین دیا ۔ اس کے علاوہ انھون نے تمام دنیا سے ہمارا رابطہ قائم کردیا ۔ اگرچہ مغل بادشاھون کے زمانے مین بھی ایران و عرب اور سینٹرل ایشیا سے ہندوستان کے دوستانہ تعلقات تھے لیکن مغلیہ سلطنت کے آخری دور مین اس مین کمی آگئی تھی ۔ لیکن انگریزون کے دور مین باھری ملکون سے تعلقات وسیع پیمانے پر قائم ہوئے اور ان کا سلسلہ جاری رہا اب ہندوستانی غیر ممالک کے حالات ان کی ترقی اور خوشحالی کے بارے مین جان سکتے تھے ۔ خط و کتابت کے وسائل ، اخبار و رسائل اور ریلوے لائن کے ذرائع غیر ممالک سے تعلقات کو استوار کردیا تھا ۔ یہی نہین بلکہ انھون نے ہندوستان کی تمام ذاتون اور نسلون کے لوگون کو یکسان عوام مین تبدیل کردیا یعنی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی عوام کو متحد کردیا ۔ اس بات سے سماجی برابری اور خیالات و معاشرے مین یکسانیت پیدا ہوئی ۔ انگریزی حکومت مین بالواسطہ اور ان کی تہذیب و تمدن نے بلاواسطہ یا غیر محسوس طور پر ہندوستانیون کے

اندر ترقی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا ۔ ہمارے اعلی ذہن اب اپنی قدیم روایات کی عظمت اور شان و شوکت سے متاثر اور مطمئن نہ رہے تھے ۔ بلکہ مذہب ، خیالات ، تعلیم ، سماج اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے "۔[1]

اس طرح معاشرے میں دو طبقے وجود میں آئے ۔ ایک وہ جو اپنی قدیم روایات پر سختی سے پابند رہنا چاہتے تھے اور ان سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کو دل سے اپنانے کو تیار نہ تھے ۔ دوسرا وہ طبقہ جنھوں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرلیا تھا اور وہ جدید طرز تعلیم و معاشرت و تہذیب کو اپنانے کے لئے خوشی سے تیار ہوگئے تھے ۔ ان دونوں طبقوں میں ہندو مسلم یکساں طور پر شریک تھے ۔ اس وقت ہندو مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا ۔ غرض یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول یعنی ۱۸۵۷ء سے قبل ایک بار پھر ملک میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا جیسا کہ مولوی عبدالحق اس زمانے کی دلی کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

" ملک میں امن و امان تھا اور یہ امن خاص کر دلی شہر میں ، جو ایک مدت سے ارضی و سماوی آفات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ، اور بھی اجاگر نظر آتا تھا ۔ چیزیں سستی تھیں ، ربی کی کمی نہ تھی ۔ حرفت و صنعت فروغ پر تھی ۔ لوگ خوشحال اور زندہ دل تھے ، شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی ۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آجکل اس کا یقین کرنا مشکل ہے ....."[2]

۱۰

۲۔ مرحوم دہلی کالج ، ص ۱۲

ہند وستا نی مصنوعات خاص طور پر سوتی کپڑا ، نیل اور شکر افغا نستا ن اور بخارا سے برآمد ہونے لگے ۔ ہند و اور مسلم سود اگر وسط ایشیا کے ملکون کا سفر کرنے لگے جہا ن پر وہ ا پنا مال فروخت کرکے وا پسی پر ریشم اور گھوڑے ہند وستا ن لاتے تھے ۔ اس تجا رت کی وجہ سے د ہلی مین د ولت کی فرا وا نی شروع ہوئی ۔ اس زما نے مین ہند وستا ن کے شرفا اونی کپڑون کی جگہ ریشم کے کپڑے ہی استعمال کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ملک کی خوشحالی کا د ار و مد ار زراعت پر بھی تھا ۔ زراعت کی ترقی اور ضروری اشیا کی فرا وا نی کی وجہ سے قیمتین کم ہوگئی تھین ۔ ضروری اشیا کی قیمتین کم ہونے کی وجہ سے غریب لوگ بھی بآسا نی زند گی بسر کرتے تھے ۔

د ہلی کی عام خوشحالی ، ترقی اور د ولت کی فرا وا نی کا اند ازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زما نے مین د ہلی مین جتنے صوفیا اور مشائخ تھے ان کی خا نقا ہون مین فتوح کی شکل مین ایک اچھی رقم آنے لگی جس سے صوفیائے کرام بڑے پیما نے پر لنگر کرتے جہا ن سینکڑون غریب اور مسا فر کھا نا کھا تے ۔ ان مشہور بزرگون مین مظہر جا ن جا نا ن اور میا ن نصیر الد ین عرف کالے صاحب کے نام قابل ذ کر ہین ۔

ان بزرگون کے علاوہ بہت سے صوفیا ، فضلا ، ا د با ، شعرا ، خطاط ، طبیب ، مصور ، نقاش ، موسیقار اور د وسرے فنکار بھی دہلی مین جمع ہوگئے تھے ۔ سرسید احمد خا ن نے اپنی کتاب آثار الصنا د ید مین ۱۱۹ ایسے اشخاص کا ذ کر کیا ہے جن کا شمار اپنے وقت کے نا مور علما و فضلا اور اہل ہنر مین ہوتا تھا اور جن کے علم و فضل اور کمال و ہنر کا ہر شخص معترف تھا [۱]

ان ارباب علم و دانش کی تعد اد بہا د ر شاہ ظفر کے د ور مین بہت ہوگئی تھی ۔

---

۱ ۔ عہد غالب کے سیاسی و سماجی حالات ، (غالب نا مہ) ص ۵۹ ۔ ۶۱

اگرچہ اس وقت بادشاہ صرف نام کا بادشاہ تھا ۔ اس کے پاس نہ تو دولت کی فراوانی تھی اور نہ ہی اس کے اختیارات اتنے وسیع تھے پھر بھی بہادر شاہ کی فیاضی ہنر پروری اور اس کی علم دوستی اپنی مثال آپ تھی ۔ شعرا ، علما اور دوسرے فنکار اس کے دربار میں رسائی رکھتے تھے اور اس کے لطف و عنایات سے مستفید ہوتے تھے ۔ مثال کے طور پر دہلی کے مشہور مصور راجہ جیون رام اور حسین ناظر شاہی دربار سے وابستہ تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ بہادر شاہ کی شخصیت دہلی کی زندگی میں ایک ادبی اور سماجی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی ۔ بادشاہ کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہت اچھا تھا ۔ وہ ہندو مسلمان میں بالکل تفریق نہ کرتا اور دونوں کے ساتھ یکساں لطف و کرم سے پیش آتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس وقت دہلی میں ہندو اور مسلمان بالکل بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے ۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے اور ایک دوسرے کے تہوار اور خوشی اور غمی کی تقریبات میں خلوص اور یگانگت کے ساتھ شرکت کرتے ۔ شاہی ملازمین میں بھی بغیر کسی امتیاز مذہب و ملت ، ہندو اور مسلم دونوں شامل تھے ۔ اس کا اعتراف اس وقت کے دہلی کالج کے پرنسپل بھی کرتے تھے ۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں ــــ

" ....چنانچہ مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ قلعۂ معلی میں عجیب ماجرا تھا کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً" ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی ہے) سب کے سب ہندو تھے ...."[1]

---

۱ ۔ مرحوم دہلی کالج ، ص ۱۲ ، مولوی عبدالحق

ہند و مسلم اتحاد اور یکجہتی کی مثال پھول والون کی سیر کے واقعہ سے بھی ملتی ہے ۔ مہرولی مین بادشاہ اور امرا و روٴسا نے موسم گرما گزارنے کے لئے مکانات تعمیر کرائے تھے ۔ برسات کے خاتمے پر مہرولی مین پھول والون کی سیر کا تہوار منایا جاتا ۔ اس تہوار کے موقع پر ہندو اور مسلمان مل کر پنکھون کا جلوس نکالتے تھے ۔ جلوس کے خاتمے پر ہندو حضرات جوگ مایا کے مندر کا اور مسلمان شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ شریف کا رخ کرتے ۔

چونکہ ملک کی خوشحالی کا دارومدار دراصل عوام کی خوشحالی اور اطمینان پر ہوتا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ملک مین مجموعی طور پر امن و امان اور خوشحالی کا دور تھا ۔ انھین اسباب کی بنا پر انیسوین صدی کے نصف اول کو دھلی کے شاہ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے ، بالخصوص بہادر شاہ کے عہد کو دھلی کے شاہ ثانیہ کی تاریخ مین بڑی اہمیت ہے ۔[1]

اگرچہ یہ دور ، سلطنت مغلیہ کے انحطاط کا دور تھا پھر بھی علم و ادب بالخصوص شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا ۔ بادشاہ خود شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدردان تھے ۔ بقول مولوی عبد الحق ـــ

" اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے وہ عام طور پر پایا جاتا تھا ۔ یہان تک کہ ان پڑھ بھی اہل ذوق کے فیض صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے ... "۔[2]

اس مین شک نہین کہ انیسوین صدی کے نیمۂ اول مین فارسی زبان و ادب کی روایات اور قدرین بحیثیت مجموعی انحطاط کے مراحل سے دوچار تھین اور ایک نئی ابھرتی ہوئی

---

۱ ۔ عہد غالب کے سیاسی و سماجی حالات ، (غالب نامہ) ص ۶۲
۲ ۔ مرحوم دھلی کالج ، ص ۱۲

زبان یعنی اردو تیزی کے ساتھ ارتقائی منازل طے کررہی تھی ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان و ادب اور اس کی علمی و ادبی نیز تمدنی حیثیت کسی نہ کسی شکل میں اب بھی باقی اور برقرار تھی ۔ اس دور میں ایک دو نہیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں سینکڑوں کی تعداد میں ارباب علم و دانش موجود تھے ۔ اس بڑی جماعت میں شاعر بھی تھے اور ادیب بھی ، نثرنگار بھی تھے اور عالم و دانشور بھی ، سخنور بھی اور سخن فہم اور سخن شناس حضرات بھی شامل تھے ۔ اس دور کے تہذیبی ، تمدنی اور ادبی ماحول کی طرف ، اس عہد کے مشہور فارسی و اردو شاعر و ادیب اسد اللہ خان غالب نے اپنی ایک مشہور غزل میں صراحۃً اشارہ کیا ہے ۔

هند را خوش نفسانند سخنور که بود
باد در خلوت شان ، مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صهبائی و علوی وانگاه
حسرتی ، اشرف و آزرده بود اعظم شان
غالب سوخته جان گرچه نیرزد بشمار
هست در بزم سخن همنفس و همدم شان

مندرجہ بالا اشعار سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کا دور شاعری کی فضا ، علمی و ادبی ذوق ، تعلیم و تعلم کے ماحول اور شعر و شاعری کے عام رواج اور اس کی مقبولیت کے اعتبار سے نہایت سازگار نیز اہمیت کا حامل تھا ۔

یہ شعر و ادب اور علمی ماحول صرف دہلی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ لکھنئو ، رامپور اور بھوپال وغیرہ بھی علم و فن کے مرکز سمجھے جاتے تھے اور وہاں بھی علمی اور ادبی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں ۔ شعر و شاعری کا مذاق عام تھا ۔ شمالی ہند کے ساتھ جنوبی ہند میں بھی علم و ادب کا ذوق ملتا تھا ۔ مثال کے طور پر

اس صدی کے اوائل میں ایک مشہور فارسی غزل نعت رسول میں کہی گئی تھی جو اتنی مقبول اور زبان زد خاص و عام ہوئی کہ اس پر سینکڑوں کی تعداد میں نہ صرف شمالی ہند وستان بلکہ جنوب میں بھی خمسے اور تضمینیں لکھی گئیں ۔ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵٤ء) سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک (یا اس کے بعد بھی جب تک کہ اخبار جریدہ روزگار مدراس ۱۹۰۳ یا ۱۹۰٤ء تک جاری رہا) سینکڑوں کی تعداد میں خمسے نظم کرد ئے گئے ۱ ۔

ان تضامین کے جو مجموعے عہد غالب میں اور کچھ بعد میں شایع ہوئے ان میں بہت سے معروف اور غیر معروف شعرا کا کلام موجود ہے ۔ چند شعرا مثلاً غالب ، مومن اور صہبائی وغیرہ کی تضمینیں فارسی میں ہیں ۔

اگرچہ اس دور کی سب سے نمایاں ترقی ، اردو زبان کی ترقی و ترویج ہے ۔ یہ دور اس کی ابتدائی ترقی کا تھا ۔ اس وقت سے یہ زبان برابر آگے ہی بڑھتی رہی ۔ اگرچہ رفتہ رفتہ فارسی زبان کی جگہ اردو زبان نے لے لی تھی لیکن اب بھی فارسی زبان کو پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے مشہور و معروف شاعر غالب اپنے اردو کلام کے مقابلے میں ، جو آج ان کی بے پناہ مقبولیت اور شہرت کا سبب ہے ، اپنے فارسی کلام کو زیادہ بیش بہا اور اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ۔

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ

بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

نہ صرف غالب بلکہ اس دور کی ایک بڑی تعداد ان مشاہیر یا شعرا کی تھی جو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی اعلیٰ ادیب اور شاعر مانے جاتے تھے مثلاً

---

۱ ۔ معارف ، ص ۲۸۸ ، سمیع الدین احمد ، اپریل ۱۹۷۸ء

آزرده ، شیفته ،مومن ، نیر رخشان ، علوی اور صہبائی وغیرہ ۔ اور اس مین ہند و مسلمان کی تخصیص نہ تھی ۔ کئی ہندو شعرا بھی ایسے تھے جو اردو کے ساتھ فارسی مین بھی طبع آزمائی کرتے تھے مثلاً اس عہد کے ایک مشہور شاعر منشی ہرگوپال تفتہ کے بارے مین خیال ہے کہ اردو مین ان کی شعری صلاحیتین صرف چند اشعار تک ہی محدود تھین اس کے برخلاف ان کی بیشتر شعری کوششین فارسی اشعار کی شکل مین نظر آتی ہین ۔

دراصل فارسی زبان کو کئی صدیون سے ہندوستان کی حکومت کی زبان ہونے کا فخر حاصل رہا تھا ۔ یعنی مسلمان حکمرانون کی آمد (گیارھوین صدی عیسوی) سے سلطنت مغلیہ کے زوال تک (انیسوین صدی عیسوی) فارسی زبان کو علمی و ادبی حیثیت حاصل رہی تھی اور ہندوستان مین فارسی زبان و ادب کی تعلیم کا رواج نہ صرف خواص بلکہ عوام مین بھی چلا آرہا تھا اور یہ کسی ایک مقام کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ بنگال ، بہار ، پنجاب ، گجرات ، دکن ، مدراس سب جگہ فارسی زبان و ادب کا چرچا تھا ۔ اس دور کے عوام کے اخلاق و آداب ، طور طریقے ، نشست و برخاست ، طرز کلام وغیرہ پر فارسی کا اثر صاف نظر آتا تھا اور یہ کچھ مسلمانون پر ہی موقوف نہ تھا بلکہ ہندو مسلمان یکسان اور پر فارسی زبان و ادب سے متاثر تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انیسوین صدی مین جبکہ فارسی زبان و ادب زوال پذیر تھا اور ریختہ گوئی کی طرف میلان طبع زیادہ پایا جاتا تھا ، اس کے باوجود فارسی ادبیات کا ذوق ، فارسی دانی اور فارسی مین شعر کہنے یا اس زبان مین کسی بھی علمی اور ادبی کارنامے کو ضبط تحریر مین لانے کا رواج اور چلن باقی تھا ۔ تہذیبی اعتبار سے نیز ادبی سطح پر فارسی کی اہمیت مسلم تھی ۔ اگرچہ اس

زمانے میں مشاعروں کی ابتدا ہوچکی تھی جس میں شعرا اپنا کلام سناتے تھے ۔ ان مشاعروں میں اگرچہ شعرا اپنی تخلیقی اور ابداعی قوتوں کو اردو زبان میں بروئے کار لانے کی کوشش زیادہ کرتے تھے لیکن علوم و فنون ، تذکروں ، علمی و ادبی معرکوں ، لغت نویسی ، خطوط نویسی اور تقریظات لکھنے نیز اساتذہ کی فارسی تصنیفات کی شروح لکھنے اور اسی نوعیت کی دوسری سرگرمیوں کے ضمن میں اہل علم اور ارباب کمال حضرات اپنی فارسی دانی کا ثبوت دیتے تھے ۔

اس عہد میں منشی نولکشور کے مشہور زمانہ مطبع ، جس کی ایک شاخ کانپور میں بھی تھی ، کے وسیلے سے سینکڑوں فارسی کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں جس میں فارسی کی قدیم و جدید کلاسیکی کتب ، دواوین اور دوسرے نثری و شعری شاہکار شامل تھے جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے تھے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں فارسی کتابوں کو چھاپنے کا رواج عام تھا ۔ اگر اس دور میں فارسی کی یہ علمی اور تہذیبی حیثیت موجود نہ ہوتی تو اس کثرت سے کتابوں کا چھپنا اور شایع ہونا ممکن نہ تھا ۔

مشرقی علوم کی تدریس کے سلسلے میں فارسی بحیثیت ایک مستقل مضمون ، ابتدائی نیز اعلیٰ مدارج پر پڑھائی جاتی تھی ۔ وہ انگریز افسر جو حاکم بن کر یہاں آئے تھے اگرچہ اپنی زبان انگریزی کو بڑھاوا دے رہے تھے اور وہی زبان اب آہستہ آہستہ سرکاری اور رسمی زبان بن رہی تھی لیکن وہ بھی باقاعدہ عربی و فارسی کے عالم مولوی صاحبان سے فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے نیز فارسی اور عربی کو نظام تعلیم میں ملک کی تمدنی اور ثقافتی ضرورتوں کے تحت برقرار اور قائم رکھنا چاہتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی ، کلکتہ اور لکھنئو جیسے مراکز میں انگریز ماہرین تعلیم ان

علوم مشرقی اور بالخصوص فارسی کی ترویج و ترقی کی بابت کوشاں تھے۔ خود بھی فارسی کی تعلیم حاصل کرتے اور مدرسوں اور کالجوں میں اس کی باقاعدہ تعلیم و تدریس کا نظام قائم رکھنا چاہتے تھے۔

علم و ادب کے اعتبار سے انیسویں صدی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں نہ صرف دہلی کے عوام کو ہی شعر و ادب سے دلچسپی تھی بلکہ بادشاہ وقت خود بھی شعر و شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چونکہ ان میں سے اکثر خود شاعر تھے اس لئے شعر و سخن کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شعر و شاعری کا ذوق ان کو ورثے میں ملا تھا جیسا کہ شاہان تیموریہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر و ہمایوں کا اعلیٰ ادبی ذوق، اکبر کی شاہانہ علمی سرپرستی اور اہل علم کے ساتھ فیاضانہ سلوک، جہانگیر اور شاہجہان کی شعر و ادب میں دلچسپی اور شعر کہنے کی صلاحیت، ایسی خصوصیات ہیں جو تیموریہ سلاطین کو دوسرے سلاطین سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ ذوق شعر و ادب ان کو وراثت میں ملا تھا۔ چونکہ تیموریہ سلاطین کی شعر و ادب سے دلچسپی موضوع سخن نہیں ہے اس لئے یہاں ان کے ادبی کارناموں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ یوں بھی شاہانہ مغلیہ کے کارنامے خواہ وہ رزم میں ہوں یا بزم میں، ان پر روشنی ڈالنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہوئی شعر و ادب سے دلچسپی اور شاعرانہ ذوق آخری تیموری حکمرانوں میں بھی کافی حد تک موجود تھا چنانچہ نہ صرف سراج الدین بہادر شاہ ظفر خود ایک اعلیٰ درجے کا شاعر تھا بلکہ اس کے ولیعہد اور دوسرے شہزادے بھی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور اکثر شعر بھی کہتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سابق سلاطین تیموریہ

کی طرح وہ شاہانہ فیاضیاں دکھانے کی استطاعت نہ رکھتے تھے پھر بھی جتنا ممکن تھا وہ ان کو نوازتے تھے چنانچہ اکثر قلعے کے اندر مشاعرے منعقد کرتے اور اس زمانے کے مشہور شعرا کو دعوت سخن دیتے۔ شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھنے کی وجہ سے شعر کے محاسن اور اس کی روح کو سمجھتے اور محظوظ ہوتے اور بہ قدر استعداد اچھے شعرا کی ہمت افزائی کرتے۔ محفل شعر و سخن میں خود بھی شرکت کرتے، شعر پڑھتے اور داد سخن حاصل کرتے۔ چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعروں کے یہاں اکثر قلعۂ معلی کے چند مشہور شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مشاعرے صرف قلعہ معلی تک ہی محدود نہ تھے بلکہ دہلی کے خواص و عوام بھی اپنے اور پر محفل شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔ دہلی کے مشہور شعرا کے یہاں تو ہر شام ہی محفل شعر و سخن جمتی اور شعرا اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ ان مشہور شعرا میں آزردہ، مومن، حسرتی، غالب اور صہبائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ــــ

" دہلی میں صہبائی، مومن، آزردہ، میر، اشرف، حسرتی کے دیوان خانے علم و ادب کے گہوارے تھے۔ یہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے ہر عالم اور امیر کا گھر ایک علمی مرکز تھا اور علم کے چرچے گلی اور کوچوں تک پھیلے ہوئے تھے ....."[1]

۱۔ غالب کی دلی، (غالب نامہ) ص ۲۲، ۲۳، خلیق احمد نظامی، جولائی ۱۹۸۲ء

صہبائی کے حالات زندگی ـــــ ایک مختصر تعارف

انیسوین صدی عیسوی کے کے نصف اول مین شعر و ادب کے آسمان پر کئی درخشان ستارے نمودار ہوئے جن کی چمک دمک سے آنکھین خیرہ ہوتی تھین ـ اگرچہ یہ دور تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے تنزل کی طرف گامزن تھا پھر بھی اس روبہ زوال عہد مین علم و ادب کو جو ترقی ہوئی اور جتنے مشہور و معروف شاعر و ادیب اس دور مین گزرے وہ ہم کو ہندوستان کی پوری تاریخ مین بہ استثنائے عہد اکبری نہین ملتے ـ

چونکہ کئی صدیون سے ہندوستان مین فارسی زبان حکومت کی زبان کے طور پر پڑھی ، لکھی اور بولی جارہی تھی اور فارسی زبان و ادب کی تعلیم ملک مین عام رہی تھی اس لئے فارسی زبان اور اس کے اثرات صرف دہلی تک ہی محدود نہ تھے بلکہ بنگال ، بہار ، پنجاب ، گجرات ، مدراس اور دکن یعنی تقریباً پورے ہندوستان پر اس کا تسلط ہوگیا تھا نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو وؤن کے اخلاق و آداب ، طور طریقے اور نشست و برخاست غرض ہر چیز فارسی زبان و ادب سے متاثر نظر آتی تھی وہ لوگ دوران گفتگو فارسی امثال اور جملون کا استعمال ہی نہ کرتے بلکہ بے اختیار ان کی زبانون پر سعدی ، حافظ ، رومی ، جامی اور خسرو کے اشعار آجاتے ـ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر مین ، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان فارسی کی مشہور و معروف کتابون جیسے گلستان و بوستان ، دیوان حافظ ، سکندر نامہ اور شاہنامہ وغیرہ کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی ـ مکتوبات ، تقریظات یا دیگر قسم کی تصنیفات مین ایک ہندو مصنف کا طرز تحریر اور انداز بیان وہی ہوتا جو ایک مسلم اہل زبان کا ـ دراصل اس دور کی قومی یگانگت مین اس دور کی ہمہ گیر تہذیب اور زبان و ادب کا

بھی بڑا ہاتھ تھا ۔

یہ قدرتی امر ہے کہ ہر وہ چیز جس کو عروج حاصل ہوتا ہے ، اس کو ایک نہ ایک دن زوال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب فارسی زبان و ادب کا انحطاط شروع ہوا اور اس کی اور مقامی زبان کی آمیزش سے ایک نئی زبان یعنی اردو وجود میں آئی ۔ جیسے جیسے اردو زبان کو عروج حاصل ہوتا گیا فارسی زبان تنزل کی طرف مائل ہوتی گئی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو زبان کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا چنانچہ اس عہد میں متعدد ایسے مشہور و معروف اردو کے شعرا و ادبا کے نام نظر آتے ہیں جن کی عظمت و شہرت آج بھی اسی قدر ہے جتنی کہ ان کے زمانے میں تھی جیسے مرزا اسد اللہ خان غالب ، حکیم مومن خان مومن ، مفتی صدر الدین خان آزردہ ، شیخ محمد ابراہیم ذوق وغیرہ ۔ ان سب کا شمار اپنے زمانے کے مشاہیر شعرا میں ہوتا تھا ۔

جس وقت فارسی زبان کا سورج غروب ہو رہا تھا اور اردو زبان اس کی جگہ لے چکی تھی ، (یہی وہ زمانہ تھا جب دہلی کالج کو فروغ ہوا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھی) اس وقت بھی فارسی زبان کا وقار اور اس کی عظمت علمی حلقہ میں باقی تھی چنانچہ اس دور کے مشہور شاعر و ادیب اردو ادب کے ساتھ ساتھ فارسی میں شعر کہنا یا کوئی نثری تخلیق پیش کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اس عہد میں زیادہ تعداد ذوللسانین شعرا کی تھی ۔ ان مشہور شخصیتوں میں سر فہرست غالب ، مومن اور صہبائی کے نام آتے ہیں ان کے علاوہ عبد اللہ خان علوی ، نواب ضیاء الدین خان نیر ، حکیم آغا جان عیش اور شیفتہ وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں ۔

مندرجہ بالا شعرا کی فہرست میں صہبائی کا نام اس اعتبار سے انفرادی حیثیت

رکھتا ہے کہ اس دور میں غالباً وہ تنہا ایسے شاعر اور ادیب تھے جنھوں نے ایسے وقت میں بھی جب اردو کا ستارہ اپنے عروج پر تھا اور غالب، مومن جیسے استادان فن فارسی کے ساتھ اردو زبان میں بھی علمی و ادبی تصانیف پیش کررہے تھے اپنی شعری اور علمی کاوشوں کے لئے فارسی کا انتخاب کیا اور اردو کو زیادہ قابل اعتنا نہ سمجھا ۔ البتہ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوتروس کے کہنے پر صنائع و بدائع کی مشہور کتاب حدایق البلاغت (مصنفہ شمس الدین فقیر) کا اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ اس کے علاوہ ایک قواعد کی کتاب اور ایک تذکرہ بھی اردو زبان میں ملتا ہے جس میں اس عہد کے چند نامور شاعروں کا ذکر اور ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے جس کا ذکر آگے آئے گا ۔

ولادت و نسب ۔

صہبائی کا پورا نام امام بخش تھا اور صہبائی تخلص کرتے تھے ۔ صہبائی کا سال ولادت صحیح کسی تذکرے میں مذکور نہیں البتہ طبقات الشعرا میں مولوی کریم الدین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۱ھ میں چالیس برس کے ہونگے ۔ اس کے مطابق ان کا سال ولادت ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۵ء ہوتا ہے ۔ کریم الدین چونکہ صہبائی کے ہم عصر تھے اس لئے ان کا بیان معتبر سمجھا جانا چاہئے ۔ صہبائی کے آباؤ اجداد قصبہ تھانیسر کے رہنے والے تھے ۔ صہبائی کے والد کا نام محمد بخش تھانیسری تھا ۔ غالباً وہ آغاز شباب میں ہی تلاش معاش میں دہلی آگئے تھے اور دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں سکونت اختیار کرلی تھی ۔ صہبائی کی ولادت دہلی میں ہی ہوئی جیسا کہ ان کے شاگرد مرزا قادر بخش قادر اپنی تالیف گلستان سخن میں لکھتے ہیں ۔

" صہبائی تخلص جناب فیض انتساب حضرت استادی استاد الانامی قدوۂ کملائے روزگار اسوۂ افاضل شہر و دیار ماہر فنون واقف

علوم غریبہ مخدومی مولائی مولوی امام بخش سلمہ اللہ تعالی ۔
وطن آبائی این جناب مستطاب کا شہر کرامت تھا نیسر صانہا اللہ
عن الشر اور مولد گل زمین لطافت آئین حضرت شاھجہان آباد حفظہا
اللہ عن الفساد ہے "۔[1]

امام بخش صہبائی کا سلسلۂ نسب اپنے والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رض
اور اپنی والدہ کی طرف سے حضرت سید عبد القادر جیلانی رح تک پہنچتا ہے ۔
کلیات کے خاتمے پر کلیات کے مولف اور صہبائی کے عزیز شاگرد میر منشی ایجنٹی
بھوپال لکھتے ہیں جس سے ان کے سلسلۂ نسب اور حالات زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے ۔

" مولانا شیخ امام بخش معمائی تخلص بصہبائی کہ برتو نسب این
چشم و چراغ دودۂ شرافت مآب روشن تر از ماہ و آفتاب
است کہ از جانب پدر بزرگوار بحضرت عمر فاروق اکبر رضی اللہ عنہ
میرسد و از طرف مادر عالی تبار بجناب سید عبد القادر جیلانی قدس سرہ
می پیوند و ظاہر است کہ درین دورۂ اخیرہ مردی عالم باین
جامعیت انواع علوم عقلی و نقلی پا در عرصۂ وجود ننہادہ ...."[2]

سرسید احمد خان لکھتے ہیں ۔

" نسب آپ کا والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رض رضی اللہ عنہ تک
پہنچتا ہے اور والدۂ مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث الثقلین
سید عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے ...."[3]

۱۔ گلستان سخن ، ص ، قادر بخش صابر
۲۔ کلیات صہبائی (خاتمہ) ص ۸۱۱ ، مطبع نظامی کانپور
۳۔ اہل دہلی ص ۱۳۸ ، سرسید احمد خان

صہبائی کی شخصیت انتہائی پسندیدہ تھی ۔ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور یہ شاید ان کے نجیب الطرفین ہونے کا ثبوت تھا ۔ وہ انتہائی نیک ، سنجیدہ ، بااخلاق ، پرخلوص اور سلیم الطبع فطرت رکھتے تھے ۔ ادنی و اعلیٰ چھوٹے بڑے ، ہندو مسلمان سب کے ساتھ وہ خندہ پیشانی اور خلوص سے پیش آتے ۔ مذہب و ملت اور فرق مراتب کا امتیاز کئے بغیر وہ ہر فرد سے اتنے خلوص اور گرم جوشی سے ملتے کہ وہ شخص ان کا گرویدہ ہوجاتا ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے حلقۂ احباب میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ۔ ان کے خلوص و محبت کا اعتراف سرسید نے اکثر کیا ہے ۔ جیسا کہ خواجہ حالی لکھتے ہیں ۔

" مولانا صہبائی سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی "۔[1]

اگرچہ شہر کے ذی مرتبہ ہندو اور مسلمانوں سے ان کے اچھے مراسم تھے لیکن اعلیٰ علمی مذاق رکھنے کی وجہ سے اس عہد کے نامور اور معروف اہل قلم ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دوستی زیادہ گہری تھی ۔ ان کے احباب میں مفتی صدرالدین آزردہ ، حکیم مومن خان مومن ، حکیم آغا جان عیش ، مولوی مملوک علی ، مولوی کریم الدین (مولف طبقات الشعرائے ہند) مرزا اسد اللہ خان غالب ، شیخ ابراہیم ذوق ، شاہ نصیر ، نواب مصطفی خان شیفتہ اور ڈاکٹر اسپرنگر کے نام اہم اور قابل ذکر ہیں ۔ اس کے علاوہ اس عہد کے بڑے بڑے علما و حکما جیسے مولانا فضل حق خیرآبادی ، حکیم احسن اللہ خان ، نذیر احمد ، آزاد وغیرہ سے بھی ان کے خصوصی تعلقات تھے ۔

---

۱ ۔ حیات جاوید ، (دوسرا حصہ) ص ۴۲۵ ، خواجہ الطاف حسین حالی ۔

خاندان ـ

مولانا صہبائی کے خاندان اور ان کی اولاد کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں ملتی پھر بھی اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی ـ

ان کے بڑے بیٹے کا نام مولوی عبد العزیز تھا ـ عزیز تخلص کرتے تھے ـ چھوٹے بیٹے مولوی عبد الکریم سوز تھے ـ صہبائی نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں نہایت اچھی کی تھی چنانچہ دونوں بیٹے پڑھے لکھے، عالم اور مذہبی خیالات رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے ـ ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعتراف نہ صرف اس وقت کے مشہور ادیبوں اور تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ بعد کے تذکرہ نویس بھی ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں ـ ان کے بڑے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے لالہ سری رام لکھتے ہیں ـــ

" عزیز مولوی محمد عبد العزیز، مہین پور مولانا امام بخش صہبائی علمی استعداد معقول تھی ـ فن سخن میں بدر عالی قدر کے شاگرد تھے ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے طبیعت کا رنگ نرالا ہے ـ بہت پرلطف اور دل میں اترجانے والے شعر کہتے تھے ـ خیالات میں باریکی ہے ـ زبان صاف ہے "ـ[1]

مرزا فرحت اللہ بیگ ان کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں ـــ

" (عزیز کی) غزل سن کر استاد ذوق نے کہا، بھئی صہبائی تمھارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے ـ خدا اس کی عمر میں برکت دے ـ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا ـ واہ میاں صاحبزادے واہ کیا کہنا ہے ـ دل خوش ہوگیا ـ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں "ـ[2]

۱ـ خمخانہ جلد پنجم ، ص ۵۸۵ ،
۲ـ دہلی کی آخری شمع ، ص ۵۸

صہبائی کے دوسرے بیٹے مولوی عبد الکریم سوز کے بارے میں مرزا قادر بخش صابر لکھتے ہیں ۔

" سوز ۔۔۔ کہیں پسر حضرت استاد ہے ۔ سال عمر اس نونہال چمنستان کمال کے ہنوز انیس بیس سے متجاوز نہیں ہوئے ۔۔۔"[1]

مندرجہ بالا سطروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلستان سخن کی تالیف کے وقت ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور چونکہ گلستان سخن میں ان کے کچھ شاگردوں کا حال بھی ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں ہی انھوں نے استاد کا درجہ حاصل کرلیا تھا ۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے وہ اپنے بڑے بھائی عبد العزیز سے بڑھ کر تھے ۔ لالہ سری رام ان کے بارے میں لکھتے ہیں ۔۔

" سوز شاعر جادو مقال ، ناثر عدیم المثال ، مولوی عبد الکریم سوز خلف اصغر و تلمیذ ارشد خسرو عقلیم سخن آرائی حضرت مولوی امام بخش صہبائی ، نقادی اور تحقیقات فن کی شہرت عالم آشنا ہے ۔ عربی ، فارسی میں صاحب تکمیل ، منطق ، حکمت اور دیگر علوم و فنون میں فارغ التحصیل ۔۔۔۔ اپنے کمالات اور ستودہ اخلاق کے باعث یکتائے روزگار خلیق ، با مروت ملنسار ۔۔۔۔ اکثر زمینوں میں بیس بیس غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں سے پڑھوا دیتے ۔ داد لینے میں انجمن سے گوی سبقت لے جاتے ۔۔۔۔ ۲۷۲ ھ میں تئیس برس کی عمر پا کر بعالم شباب گوروں کے ہاتھوں سے بے گناہ مارے گئے ۔ ان کا ضخیم اور قلمی کلیات لالہ بنارسی داس غمگین کے پاس موجود تھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ ان کی وفات کے بعد ورثاء کی کم توجہی سے ضائع ہوگیا ۔"[2]

---

۱ ۔ گلستان سخن ، جلد دوم ، ص ۲۲
۲ ۔ خمخانہ ، جلد چہارم ، ص ۲۸۳

صہبائی کے دونوں بیٹے اپنے دیگر رشتہ داروں کے ساتھ انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

صہبائی کی ایک بیٹی بھی تھیں جن کی شادی انھوں نے اپنے بھانجے وزیر الدین کے ساتھ کی تھی۔ غالباً وہ تھانیسر ہی میں رہتی تھیں۔ صہبائی کے نواسے کا ایک خط جن کا نام حمید الدین تھا، خواجہ حالی نے حیات جاوید میں نقل کیا ہے۔ جو انھوں نے سرسید کو تھانیسر سے بھیجا تھا[1]۔

صہبائی کے بڑے بھائی کا نام بیر بخش تھا وہ اپنے زمانے کے مشہور حکیم تھے۔ سرسید نے ان کو شاہجہان آباد کے معزز اور ذی علم لوگوں میں شمار کیا ہے اور علمائے کرام کے ذیل میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

"صاحب ذہن رسا، خدیو فطرت والا، حکیم بیر بخش خان، حضرت بادشاہ خلد آرامگاہ محمد اکبر شاہ کی بیشگاہ عنایت سے بخطاب حکیم دوران مخاطب ہیں۔ سلسلہ نسب کا ان کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پہنچتا ہے طرف والد ماجد سے اور حضرت غوث الثقلین سید عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ تک طرف والدۂ معظمہ سے اگرچہ وطن آبا و اجداد کا شہر تھانیسر ہے لیکن ان کا مولد و مسکن یہی خاک پاک ہے یعنی حضرت شاہجہان آباد ..... یعنی تحصیل علم حکیم نصر اللہ خان سے اور مشق نسخہ نگاری اور معالجہ مرضی حکیم احسن اللہ خان کی خدمت میں کی اور اس فن میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی۔ راقم کے ساتھ رابطہ محبت کا برادرانہ سلوک رکھتے ہیں۔ نہ ان کے خلق کی صفت بیان میں آسکتی ہے اور کمال کی تعریف لکھی جاسکتی ہے"۔[2]

۱۔ حیات جاوید، حصہ دوم، ص ۵۰۷ (فٹ نوٹ)
۲۔ اہل دہلی، ص ۵۰، ۵۱

صہبائی کے بھائی حکیم پیر بخش کے ایک لڑکے کا ذکر تذکروں میں شاعر کی حیثیت سے ملتا ہے ۔ اس کا نام عبد الحکیم اور بسمل تخلص تھا ۔ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں ۔۔۔

" بسمل تخلص گوہر تاج ارجمندی ۔ محمد عبد الحکیم فرزند دلبند جالینوس الزمان ، بقراط دوران حکیم پیر بخش سلمہ اللہ تعالی ۔۔۔۔ فن فارسی میں سلیقۂ معقول حاصل اور تحصیل علم طب میں بجان و جنان مائل ، جوان وجیہ ، خوش قیافہ ، فصیح زبان ، صاف دل ، پاک طینت ، ثمرۂ جوانی سے متمتع ۔۔۔۔۔ اللہ تعالی یوما" فیوما" جودت ذہنی اور قوت طبع میں افزائش کرے ۔۔۔۔"[1]

(حکیم پیر بخش اکبر شاہ ثانی کے دربار سے " حکیم دوران " کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے تھے) ۔

مختلف تذکروں میں صہبائی کے کئی بھانجوں اور دوسرے رشتہ داروں کے نام بھی ملتے ہیں ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالبا" ان کی دو بہنیں تھیں ۔ ان کے بھانجوں کے نام وزیر الدین اور اکرام الدین رند تھے ۔ بظاہر وزیر الدین اور اکرام الدین رند سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں ۔ وزیر الدین سے انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی بھی کی تھی ۔ اس کے علاوہ مولف سخن شعرا نے حافظ غلام احمد نکہت تخلص اور ان کے بیٹے محمد یعقوب نسیم تخلص کو بھی صہبائی کے قرابت داروں میں شمار کیا ہے ۔[2]

---

۱ ۔ گلستان سخن ، جلد اول ، ص ۲۹۲
۲ ۔ سخن شعرا ، ص ۵۲۱ ، ۵۲۲

تعلیم اور اساتذہ ۔

صہبائی کو اپنے عہد کے مشہور عالم ، عربی و فارسی دان اور علم طب کے ماہر مولوی عبد اللہ خان علوی کو شرف تلمذ حاصل تھا ۔ انھون نے صرف فارسی زبان مین ہی کمال حاصل نہین کیا بلکہ عربی صرف و نحو اور چند عربی کتب کا درس بھی ان سے لیا تھا ۔ علم طب سے بھی واقفیت حاصل کی اور علم عروض و قافیہ ، صرف و نحو اور فن معما میں بھی قدرت حاصل کی ۔ استاد کی تعلیم کے ساتھ ان کی طبع رسا اور ذہانت خداداد نے ان کے علم و فضل مین چار چاند لگا دئے اور بہت جلدی وہ خود استادی کے درجہ کو پہنچ گئے تھے ۔

وہ ہر وقت مشہور اساتذہ کے کلام اور کتب کے مطالعے مین مشغول رہتے ۔ مکتوب نویسی بھی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا ۔ خطوط لکھتے وقت وہ عبارت آرائی پر خاص زور دیتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدا سے ہی مشکل تحریر کو پسند کرتے تھے ۔ ان کے استاد مولوی عبد اللہ خان علوی کے علم و فضل کے بارے مین مولوی کریم الدین لکھتے ہین ــــ

" عبد اللہ خان فارسی خوان جو شاہجہان آباد مین مشہور تھے ، ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی متفرق جا پڑھی طب مین بھی دست قدرت رکھتے ہین نفیسی وغیرہ پڑھا دیتے ہین "۔[1]

مولانا امداد صابری لکھتے ہین ــــ

" مولانا علوی کی فارسی دانی کا سکہ ہندوستان کے باہر کے ملکون مین بھی تھا ۔ عربی زبان مین کمال حاصل تھا ۔ بہترین حکیم تھے ۔ تشخیص امراض مین مشہور تھے "۔[2]

۱۔ طبقات الشعرائے ہند ، ص ۳۷ ، طبقات چہارم

۲۔ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعرا ، ص ۲۶۱ ،

مولوی عبد اللہ خان علوی کے بارے مین سرسید کا خیال ہے ــــ

" مولوی عبد اللہ خان متخلص بہ علوی ، سن شریف آپ کا چالیس سے اور کمال ظاہری و معنوی ہزار سے متجاوز تھا اگرچہ وطن و مولد شمس آباد تھا لیکن چونکہ ایام طفلی سے بود و باش حضرت شاہجہان آباد مین رہتی تھی گویا یہ ہی وطن ہوگیا تھا ــ بہ سبب استعداد خداداد کے ہر فن مین ید طولی رکھتے تھے خصوصاً نظم و نثر تازی و دری مین اور چونکہ فن فارسی مین خواہ بہ اعتبار انشاء نظم و نثر کے خواہ بہ اعتبار درس و تدریس کے مزاولت بہ کمال اور مشغولی اوقات بہت رہی تھی ، اس فن کی نسبت سے شہرت پائی تھی ۔۔۔۔ ایک مدت گزرتی ہے کہ شاہجہان آباد سے بامید تلاش دل برداشتہ ہوکر یورپ کی طرف تشریف لے گئے ۔۔۔۔ چونکہ فن طبابت مین معجزۂ مسیحا اور ید بیضا رکھتے تھے ــ اس نواح مین اکثر آدمیون نے ان کے علاج کی برکت سے امراض صعب سے نجات پائی ۔۔۔۔ وہین ۲۷۳ ھ مین عالم باقی کی طرف راہی ہوئے ۔۔۔۔ نظم و نثر ان سے صفحۂ عالم پر بہت یادگار ہے ۔۔۔۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے ان کی عربی اور فارسی کی مہارت ، ان کے علم و فضل نیز انشا پردازی پر ان کی قدرت کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے ــ ابتدا مین جب دہلی کالج مدرسہ غازی الدین کے نام سے مشہور تھا غالباً مولوی عبد اللہ خان علوی

۱ــ اہل دہلی ، ص ۱۳۲

اس مین مدرس کی حیثیت سے موجود تھے ۔ یہ بات ہم کو "مرحوم دہلی کالج" مین عبد الحق کی تحریر سے معلوم ہوتی ہے ۔

" البتہ مسٹر ایچ ٹیلر کی رپورٹ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۴ء مین مدرسہ غازی الدین مین صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبد اللہ ان کو تعلیم دیتے تھے "۔[۱]

مولوی عبد اللہ خان علوی عربی ، فارسی ، اور اردو پر یکسان قدرت رکھتے تھے اور نظم و نثر لکھنے مین ماہر تھے ۔ ان کی تصانیف مین انشائے صفیر بلبل اور صحبت نامہ وغیرہ کئی کتابین ہین ۔ انشائے صفیر بلبل ان کے مکتوبات کے مجموعہ کا نام ہے ۔ اس کے لئے صہبائی نے بھی ایک لمبی تقریظ لکھی تھی جس مین استاد کی خدمت مین نہایت عقیدت کا اظہار کیا تھا ۔

عبد اللہ خان علوی فارسی اور اردو دونون زبانون مین شعر کہتے تھے ۔

ان مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی مین کہا جاسکتا ہے کہ صہبائی کے استاد یعنی عبد اللہ خان علوی ایک " فاضل عصر اور کامل دہر " شخص تھے جن کی سخنوری کے غالب بھی معترف تھے جیسا کہ ان کے چند اشعار سے ظاہر ہے ۔ غرض ایسے علامۂ روزگار شخص کے فیض تلمذ اور تربیت نے صہبائی کے علم و فضل کو وہ جلا بخشی کہ بہت جلد انھون نے فارسی ادب مین اپنا الگ ایک مقام بنالیا اور اپنی قابلیت اور ذہانت کو بروئے کار لاکر چند ایسے شاہکار پیدا کرنے کے قابل ہوگئے جن سے آج بھی ان کا نام زندہ ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ میدان ادب مین انھون نے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا اور اس طرح اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا ۔

---

۱ ۔ مرحوم دہلی کالج ، ص ۳

ان کے علم و فضل کا اعتراف ان کے عہد کے اکثر شاعروں و ادیبوں نے کیا ہے۔ ان کے ہم عصر اور دوست مولوی کریم الدین تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ

" .... فارسی میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کتب فارسی سے مثل ان کے کوئی ماہر نہیں۔ تمام کتب فارسیہ پر عبور ہے "[1]

نواب صدیق حسن خان ان کو اپنے وقت کے بے مثل استاد مانتے تھے چنانچہ کہتے ہیں۔

" در فنون و علوم رسمی پایۂ بلند داشت و در فارسی دانی مہارت درس کتب این زبان منصب ارجمند۔ در وقت خود ش در دہلی بے نظیر زمان می زیست و نزد اکابر و امرائے دارالخلافہ نصرت و اکرام بسر می برد ..."[2]

دہلی کالج کی ملازمت۔

دہلی کالج میں ملازمت سے قبل صہبائی معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتے تھے۔ ان کا مستقل کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ نجی طور پر امرا و رؤسا کے بچوں کو درس دیکر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں صہبائی کو دہلی کالج میں فارسی کا استاد مقرر کیا گیا اور آخر وقت تک ان کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ دہلی کالج میں تقرر کے بعد ان کی معاشی حالت کچھ بہتر ہوگئی تھی۔ دہلی کالج میں ان کی تقرری کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔

۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لیفٹننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لئے آئے تو انھوں نے تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہئے مفتی صدرالدین خان صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خان، تیسرے امام بخش صہبائی۔

۱۔ طبقات الشعرائے ہند، ص ۳۶

۲۔ شمع انجمن، ص ۲۶۲

لفٹننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا ۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روک کیوں پالنے لگے تھے انھوں نے تو انکار کر دیا ۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپیے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کرونگا ۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپیے ماہانہ کی قبول کرلی ۔ بعد کو بجاس ہوگئے ۔[1]

مرحوم دہلی کالج کی ابتدا مدرسۂ غازی الدین کے نام سے ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا ۔[2] اور جے ایچ ٹیلر اس کے معتمد مقرر کئے گئے ۔ اس سے قبل جب وہ دہلی کی مجلس تعلیمی کے معتمد تھے اور مجلس تعلیم عامہ نے ان سے دہلی کی تعلیمی حالت کی تفصیل مانگی تھی تو جے ایچ ٹیلر نے اپنی رپورٹ میں کالج قائم کرنے کی پرزور سفارش کی تھی چنانچہ ۱۸۲۵ء میں ان کی کوششوں سے دہلی کالج کا افتتاح ہوا ۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلر کا شمار دہلی کالج کے بانیوں میں کیا جاتا ہے ۔ ۱۸۵۴ء میں ٹیلر کالج کے قائم مقام پرنسپل بنائے گئے لیکن دو ہی سال بعد ۱۸۵۷ء میں غدر میں مارے گئے ۔ ان سے قبل مسٹر بوتروس اور اسپرنگر نے دہلی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا تھا ۔

مسٹر بوتروس ایک فرانسیسی ـــــ مستشرق تھے ۔ اردو کی بڑی اچھی استعداد رکھتے تھے ۔ ۱۸۴۰ء میں وہ دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور دہلی کے تمام مدارس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی ۔ ۱۸۴۱ء میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ذمہ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے فروغ دینا تھا ۔ بوتروس اس کمیشن کے معتمد تھے ۔ کمیشن نے ایک سوسائٹی قائم کی جس کی زیر نگرانی اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں جیسے ریاضی ، قانون ، کیمیا ، طبعیات ، وغیرہ ۔ اس سوسائٹی کو ، دہلی کالج ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی

---

۱ ۔ مرحوم دہلی کالج ، ص ۵۲ ا
۲ ۔ ایضاً

اور اردو سوسائٹی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ صہبائی غالباً اس ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر بوتروس کی فرمائش پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ اور ایک اردو قواعد مسٹر بوتروس کی ایما پر ہی لکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تذکرہ انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو کا بھی مسٹر بوتروس کی فرمائش پر تالیف کیا تھا۔ صہبائی کی ان تینوں کتابوں کی زبان صاف اور سلیس ہے اور یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ ان کتابوں کی تالیف و تصنیف مسٹر بوتروس کی زیر نگرانی کی گئی تھی کیونکہ مسٹر بوتروس کی خواہش اور کوشش ہمیشہ یہی رہی تھی کہ اردو کا پرتکلف پر تصنع طرز نگارش کو ختم کردیا جائے اور اس کی جگہ سلیس و سادہ زبان استعمال کی جائے چنانچہ ان کی زیر نگرانی جتنی بھی اردو کتابیں تصنیف ہوئیں یا ترجمہ کی گئیں وہ سب سادہ و سلیس اسلوب بیان کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مسٹر بوتروس کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر ۱۹۴۵ء میں دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ ایک جرمن نژاد ڈاکٹر تھے۔ عربی زبان کے ماہر تھے اور اردو و فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے کالج کے نصاب میں علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کو بھی داخل کیا۔ ان کی کوشش زیادہ تر نصاب تعلیم کو بہتر اور کارآمد بنانے کی رہی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف متعدد انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کروایا بلکہ بہت سی عربی و فارسی کی کتابوں کے اہم نسخے بہم پہنچا کر ان کو مرتب کرکے چھپوایا اور عربی و فارسی کے نصاب میں ترمیم اور ان کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اسپرنگر صہبائی کے احیے دوستوں میں سے تھے۔ یقیناً ان مستشرقین کی صحبت سے صہبائی کے نظریۂ تعلیم اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی ہوگی۔

علوم شرقیہ کا نصاب تعلیم ـ

۱۸۲۵ء سے ۴۱ ـ ۱۸۴۲ء تک عربی و فارسی کی اعلی درجون کی تعلیم بہت مشکل اور کسی حد تک ناقص تھی ـ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء کے بعد سے نصاب مین کچھ اصلاح شروع ہوئی ـ

۱۸۴۳ء مین فارسی نصاب مین مندرجہ ذیل کتابین شامل تھین ـ انشای طاہر وحید ، مینا بازار ، پنج رقعۂ ظہوری ، شاہنامہ ، نل دمن ، بہار دانش ، سکندر نامہ ، یوسف زلیخا ، نصیرای ہمدانی ، حسن و عشق نعمت خان عالی ، سہ نثر ظہوری ، دیوان حافظ ، دیوان ناصر علی وغیرہ وغیرہ ـ[1]

۱۸۴۵ء سے ڈاکٹر اسپرنگر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے ـ انھین مشرقی نصاب تعلیم کا خصوصی خیال رہتا تھا ـ ان کی رائے کے مطابق مشرقی نصاب تعلیم اس وقت اطمینان بخش نہ تھا لہذا انھون نے اس مین کچھ ترمیم اور اصلاح شروع کی ـ انھون نے کچھ کتابین یورپ سے بھی منگوائین اور بہت سی کتابون کے اردو مین تراجم کرائے ـ ۱۸۴۵ء کے نصاب مین مینا بازار ، پنج رقعہ ، سہ نثر ظہوری کے علاوہ حسن و عشق نعمت خان عالی قصاید عرفی ، نصیرای ہمدانی ، دیوان ناصر علی ، انوار سہیلی ، مینا بازار اور شاہنامہ کے بعض حصے شامل تھے ـ

۱۸۴۸ء مین پنج رقعہ (کل) مینا بازار (کل) شاہنامہ (۲۰۰ صفحے) انشای طاہر وحید ، نل دمن (۲۰۰ صفحے) بہار دانش (۱۲۵ تا ۳۰۰ صفحے) سکندر نامہ (۱۰۰ صفحے) یوسف زلیخا (تمام) نصاب مین شامل تھے ـ

۱۸۵۳ء کے نصاب فارسی مین قصاید بدر جاچ (کل) نصیرای ہمدانی (کل)

---

۱ ـ مرحوم دہلی کالج ، ص ۷۸ ، ۷۹

وقائع نعمت خان عالی (کل) پریم ساگر (صفحہ ۲۰۰ تا ۳۰۰) دیوان ناصر علی (کل) جواہر الحروف ، ساقی نامۂ ظہوری (نصف اول) ماہر وحید تا اصطرلاب ، عبد الواسع پریم ساگر (صفحہ ۴۰ تا ۱۵۰) سہ نثر ظہوری ، قواعد فارسی ، بیتال پچیسی (نصف) سکندر نامہ تا جنگ دارا ، رقعات عالمگیری (کل) زلیخا (نصف اول) ، انشائے خلیفہ (نصف اول) شامل تھے ۔[1]

ادبی کارنامے ۔

میدان ادب میں صہبائی نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ان کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے ۔ صہبائی کے ادبی کارنامے کلیات کی شکل میں آج بھی موجود ہیں ۔ ان کی کلیات دو جلدوں پر مشتمل ہے دوسری جلد کے دو حصے ہیں ۔ حصہ اول و حصہ دوم ۔ کلیات صہبائی کی پہلی جلد صہبائی کے عزیز شاگرد منشی دین دیال کی کوشش سے مع ان کے دیباچے کے ۹۶ـ۲۹۵ ھ / ۷۹ـ۱۸۷۸ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپی تھی ان کے کچھ اور شاگرد جیسے مولوی محمد حسین ہجر ناظم عدالت اندور اور منشی دھرم نرائن میر منشی ایجنٹی سینٹرل انڈیا اور دلہ بلدیو سنگھ نامی نے بھی اس کے مرتب و طبع ہونے میں کافی تعاون دیا ۔ سید محمد صدیق اور مولوی محمد حسین ہجر نے تصحیح کا کام انجام دیا ۔[2]

کلیات کی پہلی جلد مندرجہ ذیل تصنیفات پر مشتمل ہے ۔ ابتدا میں مرتب کلیات صہبائی ، منشی دین دیال کا تقریباً چار صفحات کا ایک مقدمہ بھی ہے ۔

۱ـ ریزۂ جواہر مع فرہنگ ۔ مرصع عبارت میں لکھی گئی یہ نثر سہ نثر ظہوری کی طرز پر اور سراج الدین بہادر شاہ کی مدح میں ہے ۔ یہ سینتالیس صفحات صفحات پر مشتمل ہے ۔

۱ـ مرحوم دہلی کالج ، ص ۸۰ تا ۸۴

۲ـ مولانا صہبائی (مضمون) مسالک و منازل ، ص ۳۴۲ ، از ضیا احمد بدایونی ۔

۲۔ بیاض شوق پیام ۔ متفرق نثرون یعنی دیباچے و خواتیم شروح و رسائل و تقاریظ نظم و نثر و مکاتیب نثر و رقعات پر مشتمل ہے ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کی عبارت بالخصوص خطوط اپنے عبارت کے حسن و خوبی کے لئے اپنی مثال آپ ہین ۔

۳۔ رسالہ نحو فارسی ۔ ۱۷ صفحات کا یہ مختصر رسالہ فارسی زبان کی نحو اور قواعد کے مسائل پر ہے جو فارسی سیکھنے اور پڑھنے والون کے لئے انتہائی اہم اور کارآمد ہے ۔

۴۔ دیوان صہبائی ۔ غزلیات ، قصاید ، رباعیات ، مخمس اور ابیات پر مشتمل ہے ۔ اور ۶۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔

۵۔ کافی در علم قوافی ۔ اس رسالے مین علم قوافی اور مختلف حروف و حرکات کی شرح ، اس کی خوبیان اور عیوب کا بیان اساتذہ شعرا کے اشعار سے مثالون کے ساتھ اور شمس بن قیس رازی اور احمد بن خلیل کے اقوال اور دلائل کے ساتھ ہے ۔ یہ ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۶۔ وافی شرح کافی ۔ اس مین علم قوافی کے رموز اور دقیق نکات کو دو صفحات مین مین بیان کیا گیا ہے ۔

۷۔ گنجینۂ رموز ۔ یہ ایک عجیب و غریب تصنیف ہے جس مین فن معما کے دقیق حل اور ان کی شرح بیان کی گئی ہے ۔ اور اس مین ایک بیت سے ۳۶۰ مختلف نام مستخرج ہوتے ہین ۔ اس رسالے مین صہبائی نے اعمال معمائی کی تشریح بڑی اچھی طرح کی ہے ۔

۸۔ جواہر منظوم ۔ ۳۰ صفحات پر رباعیات کا مجموعہ ہے جس مین ہر ایک رباعی سے خدا تعالی کے ننانوے نام نکلتے ہین ۔

۹۔ قطعہ معمائی ۔ ۳ صفحات پر مشتمل ایک قطعہ ہے جس میں اللہ کے نام سے علی کا نام اور علی کے نام سے اللہ کا نام نکلتا ہے ۔

۱۰۔ مخزن اسرار ۔ ۵٤ صفحوں پر مشتمل یہ رسالہ ملا کوکبی کے ایک بیت سے مختلف ناموں کے استخراج کے بیان میں ہے ۔

۱۱۔ رسالۂ نادرہ ۔ فن معما کے بیان اور فن معما کی مختلف مصطلحات کے بیان میں ہے یہ ۱٤ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۱۲۔ نتائج الافکار ۔ متقدمین کے کچھ مغلق اشعار اور مشکل رباعیات کی شرح ہے، جو وہ ایک دوسرے کی استعداد جانچنے کے لئے اور بطور امتحان پوچھا کرتے تھے ۔ یہ ٤۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۱۳۔ غواص سخن ۔ زبان فارسی کی نادر اصطلاحات اور ان کے حل مع معنی اور ان کی مثالیں متقدمین کے اشعار سے دی گئی ہیں یہ ۸۳ صفحات پر مشتمل ہیں ۔

۱٤۔ اعلاء الحق ۔ ۱۳ صفحات پر یہ رسالہ جس میں صہبائی نے ان اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو سراج الدین علی خان آرزو نے احقاق الحق میں علی حزین پر لگائے تھے ۔

کلیات صہبائی کی دوسری جلد مشمولہ حصہ اول و دوم جداگانہ مطبع نولکشور لکھنئو سے ۸۰۔۱۸۷۹ء / ۱۲۹٦ھ میں چھپی تھی ۔ اس کا حصہ اول اس وقت کے مشہور نثری شاہکار کی شروح پر مشتمل ہے ۔

۱۔ شرح سہ نثر ظہوری (مصنفہ نورالدین ظہوری) ۔

۲۔ شرح مینا بازار (" ")

۳۔ شرح پنج رقعہ (ارادت خان واضح)

٤۔ شرح شبنم شاداب ۔ (ظہیرای تفرشی)

جلد دوم (حصہ دوم) مین حسب ذیل آثار شامل ہین ۔

۱۔ شرح حسن و عشق ۔ (نعمت خان عالی)

۲۔ شرح معمای نصیرای همدانی ۔

۳۔ شرح معمای جامی

۴۔ حل مقامات رسالہ عبد الواسع ہانسوی

۵۔ رسالہ مناقشات سخن

۶۔ رسالہ قول فیصل ۔ خان آرزو کے تصنیف کردہ رسالے تنبیہ الغافلین کے جواب مین بطور محاکمہ لکھا گیا ہے ۔

۷۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ۔

۸۔ ترجمہ حدائق البلاغت ۔

۹۔ مخمس صہبائی بر غزل قدسی و تقریظ بر دیوان خواجہ حافظ شیرازی ۔

۱۰۔ واجب العرض مولف کلیات صہبائی ۔

۱۱۔ خاتمہ تقریظات و قطعات تاریخ از سخنوران بلند فکر ۔

مندرجہ بالا صہبائی کے حالات زندگی ان کی تصنیفات علمی و ادبی نیز ان کے شاگردون کی طویل فہرست دیکھ کر ہم بخوبی اندازہ کرسکتے ہین کہ اپنے زمانے مین صہبائی کا علم و فضل اور ان کی قابلیت و صلاحیت فارسی کے قادر الکلام اور استاد شاعر کی حیثیت سے کتنی زیادہ تھی ۔ اگر ان کے بارے مین مزید تحقیق سے کام لیا جائے تو یقینا" ان کے کچھ اور بھی شاگردون کی فہرست اور ان کے حالات همین دستیاب ہوسکین گے اور جو یقینا" صہبائی کے علم و مرتبہ کو پہچاننے مین ہماری مدد کرینگے ۔

علمی و ادبی سرپرستی ـ

صہبائی کے سلسلے میں مختلف تذکرے اور مآخذ کے مطالعے سے ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے ـ اگر ان کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ مقالہ بہت طویل ہوجائے گا بلکہ ہم اپنے موضوع سے بھی دور ہوجائیں گے لیکن یہاں پر مختصراً ان کے شاگردوں کے بارے میں بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ صہبائی کے علم و فضل اور ان کے مرتبے کا صحیح اندازہ کیا جاسکے ـ اور یہ معلوم ہوسکے کہ اس وقت کی علمی و ادبی سرپرستی میں ان کا کتنا بڑا ہاتھ رہا تھا ـ صہبائی کے شاگردوں کی فہرست ذیل میں دی جارہی ہے ـ

۱ـ منشی دین دیال جنھوں نے ان کی کلیات کو مرتب کرکے شاگردی کا حق ادا کیا اور اس طرح اپنے مرحوم استاد کے لئے نذرانۂ خلوص اور عقیدت پیش کیا ـ

۲ـ ماسٹر پیارے لال آشوب ـ ان کے بارے میں مولوی عبدالحق نے مرحوم دہلی کالج میں تفصیل سے لکھا ہے ـ وہ کئی اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر پھر مدارس کے انسپکٹر بھی رہے ـ لاہور جانے سے قبل دہلی سوسائٹی جو اس وقت کی ایک علمی و ادبی انجمن تھی ، اس کے سکریٹری بھی رہے ـ جب وہ دہلی سے جانے لگے تو سوسائٹی کی جانب سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جس پر دہلی کے مشہور اور سربرآوردہ حضرات اور سوسائٹی کے ممبران کے دستخط تھے ـ مرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ عبارت بھی تحریر فرمائی ـ

" فقیر اسداللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ہوا ہے وہ میرا جی جانتا ہے ـ بس اب میں نے جانا کہ میرا دل میں کوئی نہیں ہے "ـ[1]

۱ـ مرحوم دہلی کالج ، ص ۶۷-۶۶

۳۔ پنڈت دھرم نارائن ۔جو میر منشی ایجنٹی سینٹرل انڈیا تھے ۔

٤۔ محمد حسین ہجر ۔

۵۔ ایجاد ۔مرزا رحیم الدین دہلوی خلف شہزادہ حسین بخش شاگرد مولوی امام بخش صہبائی ۔

٦۔ آہی ۔ میر عبدالرحمن خلف ارشد میر حسین تسکین ۔

۷۔ اثر ۔ منشی عبدالرزاق خلف منشی عبدالرحمن تمنا ۔

۸۔ اوج ۔لالہ جگل کشور

۹۔ بسمل ۔ نواب امیر حسن خان ساکن دارالامارت کلکتہ ۔

۱۰۔ بلبل ۔ پنڈت گوری شنکر ۔

۱۱۔ تمنا ۔ عبدالرحمن تمنا مولوی محمد حسین ہجر کے برادر حقیقی تھے ۔

۱۲۔ حسرت ۔ منولال کائستھ تھے ۔

۱۳۔حیرت ۔ حافظ عبدالرحمن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے ۔

۱٤۔ رحمت ۔ رحمت علی رحمت مولانا صہبائی کے قرابت دار تھے ۔

۱۵۔ زار ۔ حافظ امام بخش نابینا تھے ۔

۱٦۔سحر ۔ احمد علی خان ، والد کرم علی خان تھے ۔

۱۷۔ شرر ۔ منسا رام کائستھ تھے ۔

۱۸۔ شفقت ۔ سید محمد حسین گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے ۔

۱۹۔ شوق ۔ عنایت اللہ شوق فرید آباد کے رہنے والے تھے ۔

۲۰۔ صابر ۔ مرزا قادر بخش صابر خلف مرزا مکرم بخت نبیرۂ مرزا معزالدین جہاندار بادشاہ مولانا صہبائی اور عبدالرحمن خان ضامن کے شاگرد تھے ۔ صاحب دیوان تھے ۔ تذکرہ گلستان سخن ان کی تالیف ہے ۔

۲۱۔ عیش۔ رائے عزت سنگھ منشی دفتر خالصہ تھا ۔

۲۲۔ عنایت۔ عنایت علی خان برادر خورد عباس علی خان بیتاب ۔

۲۳۔ غریب۔ غریب اللہ غریب شاہ آباد کے رہنے والے تھے ۔

۲۴۔ فدا ۔ مرزا بلند بخت دہلوی خلف شہزادہ مکرم بخت برادر حقیقی مرزا قادر بخش صابر ۔ صاحب گلستان سخن ۔

۲۵۔ فرغان ۔ پنڈت لال ارشاد

۲۶۔ سلطان خان قلق پٹھان تھے ۔

۲۷۔ مبتلا ۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے ۔ پنڈت دھرم نرائن کو صہبائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا رسالہ قول فیصل انھیں کے یہاں دستیاب ہوا تھا ۔

۲۸۔ نامی ۔ بلدیو سنگھ صہبائی کے کھ خلوط ان کے نام ملتے ہیں ۔

۲۹۔ نثار ۔ میر نثار علی ابن مولوی عبد اللہ بڑے خاندانی تھے ۔

۳۰۔ نگہت۔ حافظ غلام احمد نگہت ۔ مولانا صہبائی کے قریبی رشتہ دار تھے ۔

۳۱۔ نور حق ۔ شاہ محمد جمیل دہلوی خلف خواجہ محمد خلیل ۔

۳۲۔ رفعت۔ شاہزادے مرزا پیارے رفعت دہلوی ۔ صاحب دیوان تھے ۔ اوائل میں حافظ عبد الرحمن احسان سے اصلاح لی ۔ بعد میں حضرت صہبائی سے تلمذ اختیار کیا ۔

۳۳۔ عزیز ۔ مولوی محمد عبد العزیز خلف مولوی امام بخش صہبائی ۔ ان کا ذکر صہبائی کے فرزند کی حیثیت سے اس سے قبل تفصیل سے کیا جا چکا ہے ۔

۳۴۔ سوز ۔ مولوی عبد الکریم سوز خلف اصغر و تلمیذ ارشد حضرت مولوی امام بخش صہبائی ۔ ان کا ذکر بھی فرزند کی حیثیت سے تفصیل سے کیا جا چکا ہے ۔

مندرجہ بالا صہبائی کے شاگردوں کے نام تذکرہ گلستان سخن (مولفہ قادر بخش صابر) اور تذکرۂ سخن شعرا (مولفہ عبدالغفور نساخ) میں ملتے ہیں نیز ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا (مصنفہ مولانا امداد صابری) میں بھی کچھ شاگردوں کے نام دئے گئے ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ اگر مزید تحقیق کی جائے تو اس سے کہیں زیادہ شاگردوں کے نام اور مل سکتے ہیں۔

وفات۔

۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں صہبائی انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ انتہائی دردناک ہے۔ مولانا امداد صابری، علامہ راشد الخیری کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

" مولانا قادر علی صاحب مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دندناتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خارناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دیدی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہوکر دریا کے کنارے لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آن کر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا۔

مگر مامون صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے اس لئے دل نے گوارا نہیں کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن مامون صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لئے میں دریا میں کود پڑا ۔ ۰۰۰۰ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہونگا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گرگر مر گئے ۰۰۰"[1]

مفتی انتظام اللہ شہابی ان کی شہادت کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

" مولانا امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی قصہ خوان اور جیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ ، سنا گیا ہے کہ اسی محلے کے چودہ سو آدمی گرفتار کرکے راجگھاٹ کے دروازے سے دریا پار لے جاکر بند وقوں کی باڑیں مار دی گئیں ۔ لاشیں دریا میں بھنکوا دی گئیں "[2]

صہبائی کی دردناک موت پر بے اختیار آزردہ کی زبان سے نکل جاتا ہے ۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکبر اپنے رنج و غم کا اظہار ان اشعار میں کرتے ہیں ۔

نوجوانوں کو ہوئیں بھانسیاں بے جرم و قصور
ماردی گولیاں سایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر و پسر[3]

---

۱ ۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا ۔ ص ۲۷۳
۲ ۔ غدر کے چند علما ، ص ۲۷
۳ ۔ ایضاً

باب دوم

صہبائی ـــــ بحیثیت شاعر

۱ـ تخلیقات شعری کا تفصیلی مطالعہ

اور

کلام پر تبصرہ

۲ـ صہبائی کی شاعرانہ اہمیت

۳ـ صہبائی اور بیدل

صہبائی بحیثت شاعر ۔

انیسوین صدی کا نصف اول سیاسی اعتبار سے انتہائی انتشار اور بد امنی کا دور تھا ۔ یہ پر آشوب دور تھا جب مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور آن بان کی آخری شمع بھی بجھنے کو تھی ۔ ملک مین بد امنی اور کشاکش کی فضا ہونے کے باوجود شعر و ادب کے گلستان مین اس وقت بھی کافی رونق نظر آتی تھی ۔ علم و ادب کے لئے سیاسی حالات نا سازگار ہوتے ہوئے بھی اس وقت دہلی مین کچھ اہل علم و ذوق ایسے جمع ہوگئے تھے جو وقتاً فوقتاً بزم سخنوران آراستہ کرتے رہتے تھے اور جن کے علمی و ادبی کارنامون کی وجہ سے اس دور کو بعد مین بہت زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی ۔ مختصر یہ کہ یہ دور نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ علم و فن کے اعتبار سے بھی کافی اہمیت کا حامل ہے ۔

جیسا کہ قبلاً لکھا جاچکا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر دور مین فارسی زبان بھی دور انحطاط سے گزر رہی تھی اور اس کی جگہ اردو زبان نے لے لی تھی ۔ لیکن اس وقت بھی فارسی زبان کو پڑھے لکھے لوگون یا اہل علم و دانش کی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا اور ہندوستان مین فارسی زبان و ادب کا چرچا ہنوز باقی تھا اگرچہ اب اردو روز مرہ کی زبان بن چکی تھی اور اہل علم حضرات اردو زبان مین شعری اور نثری کارنامے انجام دے رہے تھے لیکن اردو زبان مین شعری و نثری تخلیق پیش کرنے والے اہل علم بھی فارسی زبان مین شعر کہنا یا نثری تخلیق پیش کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے ۔ فارسی زبان مین لکھے ہوئے اپنے شاہ پارون کو صحیح معنون مین اپنے کارنامے تصور کرتے تھے ۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس دور مین بیشتر ذوللسانین شعرا و ادیب نظر آتے ہین جو وقتی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اردو

زبان مین اپنی تخلیقات تو پیش کرتے ہی تھے ساتھ ہی اہل علم و دانش کی نظر مین مقام حاصل کرنے کے لئے فارسی مین بھی اپنا کلام اور نثری تخلیقات پیش کرتے اور اردو سے زیادہ اس پر نازان ہوتے تھے ۔ مثال کے طور پر اس دور کے اور آج کے بھی مشہور و معروف شاعر غالب اپنے اردو کلام سے زیادہ اپنے فارسی کلام کو اہمیت دیتے اور اس پر ناز کرتے تھے چنانچہ کہتے ہین ۔

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست

صرف غالب ہی نہین بلکہ اس دور مین ایک بڑی تعداد ان مشاہیر یا شعرا کی تھی جو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کا اعلی ذوق رکھتے تھے اور خود فارسی زبان کے مشہور ادیب اور شاعر مانے جاتے تھے جیسے مومن ، آزردہ ، شیفتہ ، علوی ، نیر رخشان اور صہبائی وغیرہ ۔

صہبائی کا شمار اپنے زمانے کے ان اہل قلم مین ہوتا تھا جو فارسی زبان سے فطری مناسبت اور لگاؤ رکھتے تھے ۔ ایک اعتبار سے ان کی اہمیت اس لئے اور بڑھ گئی تھی کہ اس دور مین وہ تنہا شاعر و انشا پرداز تھے جنھون نے کبھی فارسی کے مقابلے مین اردو کی طرف زیادہ توجہ نہ کی ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مین ان کے آثار علمی صرف دو تین ہی ہین جبکہ ان کے بیشتر کارنامے خواہ وہ نظم مین ہون یا نثر مین فارسی زبان مین ہی پائے جاتے ہین ۔

اس امر پر سب متفق ہین کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ صہبائی کے فارسی کلام کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاعری کا ایک اجمالی خاکہ یعنی شاعری کے ابتدائی دور سے صہبائی کے دور تک جتنے سبک وجود مین آئے ان کا ذکر مجملاً کر دیا جائے ۔ ان ادوار کا اجمالی جائزہ اس لئے بھی ضروری ہے

تاکہ ہم یہ جان لین کہ صہبائی نے جس دور مین آنکھ کھولی اس مین شاعری کا اسلوب اور طرز نگارش نیز اس کی خصوصیات کیا تھین اور صہبائی اپنی فارسی شاعری مین اس سب کی پیروی پر کیون مجبور ہوئے ۔

جب بھی کبھی ایران و ہندوستان کی فارسی شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ مقصود ہوتا ہے تو شعری ادب کو تین اسالیب مین تقسیم کیا جاتا ہے اگر موجودہ دور کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ ادوار چار ہوجاتے ہین ۔

۱۔ سبک خراسانی

۲۔ سبک عراقی

۳۔ سبک ہندی

۴۔ سبک جدید

۱۔ سبک خراسانی ۔

فارسی ادب کی ابتدا سے تقریباً پانچوین صدی ہجری تک یعنی سامانی اور غزنوی دور مین جس قسم کی شاعری ہوتی تھی وہ سبک خراسانی کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس کا مرکز زیادہ تر ایران کا شمال مشرقی علاقہ تھا جس مین ماوراالنہر وغیرہ بھی شامل ہے ۔ اس دور کی خصوصیات سادگی خیال و سادگی بیان تھین ۔ صفائی ، سلاست ، الفاظ کی متانت اور انسانی جذبات کی ترجمانی اس سبک کی بنیادی خصوصیات تھین ۔ تشبیہہ و استعارہ کا استعمال زیادہ نہ تھا ۔ بے ساختگی اور برجستگی خوبیٔ کلام سمجھی جاتی تھی ۔ یہی وہ دور تھا جب رودکی ، فرخی ، منوچہری اور فردوسی کے نغمون سے ایران کی فضا گونج رہی تھی ۔ اس دور کی شاعری مین مختلف مضامین کا استعمال زیادہ مروج نہ ہوا تھا بلکہ شاعری صرف اسلاف کے کارنامے ، دلی جذبات کے اظہار اور قدرتی مناظر کے بیان کے لئے ہوتی تھی ۔ اس زمانے کی

شاعری زیادہ تر قصاید اور مثنویات پر مشتمل تھی ۔ غزنوی دور کے آخر سے اس میں تبدیلی آنا شروع ہوجاتی ہے ۔

۲۔ سبک عراقی ۔

اس دور کی شاعری میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ " سبک عراقی " کہلاتی ہیں اس سبک کا آغاز تقریباً " سلجوقی دور کے آغاز سے ہوتا ہے یعنی چھٹی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کا دور سبک عراقی کے نام سے موسوم ہے ۔ اس وقت مرکز شعر شمالی مشرقی ایران سے بدل کر جنوبی ایران (شیراز) ہوگیا تھا ۔ غزنوی دور کی صاف اور سادہ زبان کی جگہ تصنع کا استعمال شروع ہوگیا اور صنایع و بدایع کو کلام کی خوبصورتی سمجھا جانے لگا ۔ اس دور کی خصوصیات شاعری تشبیہات و استعارات نیز عربی الفاظ ، محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال تھیں ۔ سبک خراسانی کی خصوصیات یعنی جذبات کی سادگی اور طرز ادا کی بے ساختگی ختم ہوگئی اور اس کی جگہ بلاغت اور خیالات میں تصوف کی آمیزش شروع ہوئی ۔ ترکیب بندی دقت پسندی اور مضمون آفرینی کا آغاز ہوگیا ۔ زبان زیادہ منجھ گئی ۔ اس سب کے نمایندہ شاعروں میں خاقانی ، کمال اسمعیل اور ظہیر فاریابی ہیں ۔ سعدی اور حافظ کا شمار بھی اگرچہ اس عہد کے شعرا میں ہوتا ہے لیکن سعدی اور حافظ کے یہاں ہم کو سبک عراقی کی خصوصیات کا استعمال اعتدال کے ساتھ نظر آتا ہے ۔ غالباً " اگر یہ کہیں تو بےجا نہ ہوگا کہ خسرو اور حسن کی طرح انھوں نے بھی " سبک خراسانی " اور " سبک عراقی " کے امتزاج سے کام لیا ہے ۔

۳۔ سبک ہندی ۔

سولہویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) سے فارسی شاعری پر ایران کی جگہ

ہند وستان کا غلبہ زیادہ ہوگیا اس لئے اس سبک کو "سبک ہندی" کا نام دیدیا گیا اگرچہ ہند وستان مین فارسی زبان قطب الدین ایبک (۶۰۲ ھ) کے زمانے سے رائج تھی نہ صرف درباری زبان بلکہ علمی زبان کا درجہ بھی فارسی کو ہی حاصل تھا ۔ اس کے بعد سے مختلف خاندانون کو عروج و زوال ہوا لیکن فارسی زبان کی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہی ۔ یہان تک کہ مغلیہ سلطنت کو عروج حاصل ہوا ۔ مغل بادشاہون کے زمانے مین فارسی شاعری اور زبان و ادب کو جو ترقی ہوئی اس کی تفصیل بتانے کا یہان نہ موقع ہے اور نہ ضرورت ۔ صرف اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ مغلیہ سلطنت کے دور مین ہند وستان مین جو فارسی نظم و نثر کا سرمایہ وجود مین آیا وہ نہ صرف کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ تھا بلکہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بھی ایران کی خصوصیات سے مختلف تھا ۔ اس کی وجہ سے اس دور کا سبک "سبک ہندی" کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس کی اور بھی کئی وجوہات تھین ۔

۱۔ چونکہ اس دور مین فارسی شاعری کا مرکز ہند وستان ہوگیا تھا اس لئے اس مین کچھ نئے الفاظ اور کچھ اصطلاحین داخل ہوگئین جو یقیناً ہند وستان کی دین تھین ۔

۲۔ "سبک ہندی" کے اختیار کرنے والے شعرا مین کچھ تو ایرانی شعرا مغلیہ دربار کی سرپرستی اور ادب نوازی کا چرچا سن کر ہند وستان آئے اور یہان کی سکونت اختیار کرلی ۔ کچھ شعرا ہندی نژاد تھے لیکن انھین زبان کی طرح فارسی زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے اور فارسی زبان مین طبع آزمائی کرتے تھے ۔

جس وقت ایران مین صفوی بادشاہ حکمرانی کررہے تھے ، اس وقت ہند وستان مین مغلیہ سلطنت کا عروج تھا ۔ مغل فرمانروا اپنی علم دوستی اور ادب پروری کے لئے ہی مشہور نہ تھے بلکہ وہ خود شعر و سخن کا اعلی ذوق رکھتے تھے اور

فارسی زبان و ادب کے نہایت قدر دان تھے ۔ شاعروں کو موتیوں میں تلوانے والے یہ شاہان مغلیہ ایرانی شاعروں کے لئے بھی کشش کا باعث بنے ۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ ایران کے برخلاف، بلا کسی امتیاز کے اہل ہنر اور اہل قلم حضرات کی قدر دانی اور جود و کرم کی بارش کررہے تھے ۔ چنانچہ اس دور میں فارسی شعر و ادب ہندوستان میں خوب پھلا پھولا اور شاعری کی ہر صنف کو ترقی ہوئی ۔

مغل بادشاہوں کی فیاضی، شاہانہ سرپرستی اور علم دوستی کے زیر اثر شاعروں کو اطمینان اور بے فکری حاصل ہوگئی تھی جو کے نتیجہ میں ان کے یہاں رجائیت (optimism) کا احساس پیدا ہوا ۔ بے فکری اور آسودہ زندگی ملی تو ان کے ذہن تخئیل کی پرواز کرنے لگے ۔ یعنی ان کے تخئیل اور تفکر سے شاعری میں جدتیں پیدا ہونے لگیں ۔ نہ صرف مضامین کے اعتبار سے شاعری کو ترقی ہوئی بلکہ زبان کو بھی وسعت بخشی ۔ تہ در تہ معانی کا استعمال، ایہام اور مبالغے نے ان کے کلام کو دقیق ضرور بنا دیا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری نے اس جمود کو ختم کردیا جو ایران میں جامی کے بعد نظر آتا ہے ۔ (جامی کے بعد ایران کے فارسی ادب میں کئی سو سال تک کسی بڑے یعنی صف اول کے شاعر کا نام نظر نہیں آتا ۔ البتہ صف دوم کے شعرا ضرور ملتے ہیں)۔

چونکہ فارسی شاعری کو کئی سو سال کی مدت گزر چکی تھی اور ہر صنف سخن اور ہر مضمون کو، خواہ وہ عشق و محبت ہو، تصوف و فلسفہ ہو یا اخلاق، اور اس کی باریکیوں کو بار بار بیان کیا جاچکا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اب کوئی موضوع باقی نہیں رہ گیا ہے ۔ تشبیہہ، استعارے اور صنائع بدائع ہر چیز کا استعمال پرانا ہوچکا تھا ۔ مختصر یہ کہ موضوع اور زبان کے اعتبار سے کوئی نیا پن باقی نہیں رہ گیا تھا چنانچہ "سبک ہندی" کے شعرا نے زبان کو وسعت دی اور مضمون پردازی اور

معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ نئی نئی تشبیہات ، استعارات کا استعمال شروع کیا ۔ اس کے علاوہ تہہ در تہہ مضامین اور بر ازکار خیالات کے اظہار کے لئے نئے نئی تراکیب وضع کین ۔ چنانچہ شبلی ایک جگہ کہتے ہین ۔

" ۔۔۔۔ متاخرین کا یہ خاص انداز ہر کہ جو بات کہتے ہین پیچ دے کر کہتے ہین ، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو خیال کئی شعرون مین ادا ہوسکتا ہے اس کو ایک شعر مین ادا کرتے ہین ۔۔۔ کبھی یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مبالغہ یا استعارہ یا تشبیہہ دور ازکار ہوتی ہے اس لئے سننے والے کا ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل نہین ہوسکتا ۔"[1]

مختصر یہ کہ لب و لہجہ کی سادگی اب صناعی اور تخئیل کی طلکاریون مین بدل گئی تھی کلام مین پیرساختگی اور روانی کی جگہ مشکل پسندی اور آرائش لفظی نے لے لی تھی ۔ اب شعر کوئی صرف احساس کی ترجمان ہی نہ تھی بلکہ ادراک و افکار کی منزلین طے کرنے لگی تھی ۔ مضمون کے ساتھ طرز بیان مین بھی جدتین کی جانے لگین ۔ ان خصوصیات کی بنا پر " سبک ہندی " دوسرے اسالیب سے الگ پہچانا جاسکتا ہے ۔

سبک ہندی کے نمایندہ شعرا مین قدسی ، عرفی ، فیضی ، ظہوری ، صائب ، کلیم اور بیدل کے نام آتے ہین ۔

بیدل نے شعر مین فلسفہ اور تصوف کی آمیزش کی اور اس کے اظہار کے لئے نئے نئے الفاظ و تراکیب کو ایجاد کرکے شعر کو گھہ اور مشکل اور ادق بنا دیا ۔ یعنی بیدل نے " سبک ہندی " کی روایت کو اپنی معراج پر پہنچا دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ مابعد مین " سبک ہندی " کی طرز " طرز بیدل " کے نام سے بھی

---

1 ۔ شعر العجم (حصہ سوم) ص ۲۰ - ۲۱

مشہور ہوئی ۔

بیدل کے بعد " سبک ہندی " کا نمایندہ شاعر صہبائی کو کہا جاسکتا ہے ۔ جیسا کہ مولانا حالی اپنی کتاب " یادگار غالب " میں پتے ہیں ۔۔

" دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شایع ہوئی اور عنوی اور صہبائی پر آکر ختم ہوگئی "۔[1]

صہبائی غالب کے ہم عصر تھے ۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ غالب کے عہد میں " سبک ہندی " مروجہ روش تحریر سمجھی جاتی تھی یعنی " طرز بیدل " کی تقلید عام تھی ۔ غالب جیسے انفرادی شخصیت رکھنے والے شاعر بھی اپنی شاعری کے آغاز میں بیدل کا تتبع کرتے تھے ۔ بعد میں جب انھیں بیدل کی دقت پسندی کا اندازہ ہوا تو انھوں نے بیدل کی روش کو چھوڑ کر ابتدائی مغل سلطنت کے شعرا کی طرف توجہ کی ۔ اس طرح غالب نے اپنی طرز تحریر کو سبک ہندی کی مروجہ طرز سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ۔ لیکن صہبائی طبعاً " مشکل پسند اور دقیقہ سنج تھے اس لئے وہ آخر تک طرز بیدل سے اپنے کو آزاد نہ کراسکے ۔

تخلیقات شعری کا تفصیلی مطالعہ اور کلام پر تبصرہ ۔

صہبائی کے فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہم کو ان کی کلیات (جلد اول میں (صفحہ ۲۳۷ سے ۳۰۰) ملتا ہے جو ٦٤ صفحات پر مشتمل ہے ۔[2]

۱۔ یادگار غالب ، ص ۵۸۳

۲۔ صہبائی کا ایک مخطوطہ دیوان آزاد لائبریری (علی گڑھ یونیورسٹی) کے منیر عالم کلیکشن میں دستیاب ہے جو ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا ۔ راقم الحروف نے اپنے مقالے کی تیاری کے دوران استفادہ بھی کیا ہے اس میں اور مطبوعہ دیوان میں چند معمولی سے فرق ملتے ہیں ۔ آئندہ کبھی ان کے دیوان کو مدون کرنا مقصود ہوا تو اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے ۔

ان کا فارسی کلام ۶۱ غزلیات ، ۶ قصائد ، ۱۲۰ رباعیات اور ۱۴ ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ دیوان میں ایک مخمس بھی شامل ہے۔ جس میں چھ بند ہیں یہ مخمس شوکت بخاری کی ایک غزل پر تضمین ہے۔ اس کے علاوہ صنعت معما میں کہی گئی رباعیات کا ایک مجموعہ " جواہر منظوم " کے نام سے کلیات صہبائی (جلد اول) میں شامل ہے۔ صہبائی کی ایک مثنوی " دمغ الباطل " بھی تھی جو اب نایاب ہے۔[1]

صہبائی کے نثری کام کے مقابلے میں شعری حصے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان اور شعر گوئی پر قدرت رکھنے کے باوجود ان کو شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ شوقیہ یا ضرورتاً شعر کہتے تھے۔ یعنی کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے یا کبھی کسی کی مدح مقصود ہوتی یا شعر کبھی تفنن طبع کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کو جتنی دلچسپی علمی و ادبی کاموں سے تھی اتنی شعر و شاعری سے نہ تھی۔ چونکہ اس دور میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا اور پڑھا لکھا شخص شوقیہ یا اس شعر و ادب کے ماحول میں شعر کہنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا چنانچہ صہبائی بھی جن کا شمار اپنے زمانے کے مشہور عالموں اور ادیبوں میں ہوتا تھا ، کس طرح اس روایت سے بچ سکتے تھے۔

اگرچہ صہبائی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن انھوں نے حسب روایت دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ دیوان میں غزلیات کے علاوہ صرف چند قصاید اور چند رباعیات ہی شامل ہیں۔ البتہ قطعات اور مثنوی کے اشعار ان کی نثر میں جستہ جستہ بکھرے ہوئے ہیں جن کی مجموعی تعداد تقریباً دیوان کے اشعار کی تعداد کے برابر ہے۔

۱۔ امام بخش صہبائی ، ص ۲۵۴ ، ۲۵۵

ذیل مین ان کے قصاید ، مثنوی ، رباعیات اور غزلیات پر الگ الگ تبصرہ کرنے کے بعد بطور مجموعی ان کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیا جائے گا ۔

قصاید ۔

اگرچہ ان کے قصاید کی تعداد بہت کم ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ شعر و شاعری کو انھون نے ذریعۂ معاش نہین بنایا تھا ۔ اور نہ ہی وہ اسکو عزت افزائی کا سبب جانتے تھے بلکہ وہ موقیہ شعر کہا کرتے تھے ۔ اس لئے ان کے کلام مین دیگر اصناف کے مقابلے مین غزلیات ہی زیادہ ملتی ہین ۔ اور قصیدے بہت کم ہین ۔ ان کے دیوان مین ٦ اور رسالہ نادرہ کے آخر مین ایک ، کل ملاکر سات قصیدے ملتے ہین جن مین کچھ فرمائش پر لکھے گئے ہین اور کچھ جذبۂ عقیدت سے مجبور ہوکر ۔

ان سات قصیدون مین سے دو ٹامسین صاحب لفٹیننٹ گورنر کی تعریف مین ہین اور دو بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر اور ولیعہد مرزا فتح الملک کی مدح مین ہین ۔ باقی قصیدون کی ابتدا مین ممدوح کے نام نہین دئے ہین لیکن پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو قصیدے مفتی آزردہ ، جن سے صہبائی کو کافی قربت اور عقیدت تھی کی مدح مین اور ایک سرسید احمد خان کی تعریف مین ہے ۔ جن کے ساتھ ان کو برادرانہ اخوت تھی ۔ یہ قصیدے وہ ہین جو دلی جذبات یعنی محبت اور عقیدت کے اظہار کے طور پر لکھے گئے ہین اور جو بناوٹ اور تصنع سے پاک ہین ۔

ا ۔ دیوان مین ترتیب کے حساب سے پہلا قصیدہ سرسید احمد خان کی مدح مین مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

زبس در سینہ جا دادیم عشق آتش فشان را

شرر گل میکند از ہر نفس آہنگ افغان را

یہ قصیدہ ۶۸ اشعار پر محیط ہے ۔ مدح کے دوران اسمیں جگہ ممدوح کو لفظ جواد سے مخاطب کرتے ہیں نیز ممدوح کو خلعت بانے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ سرسید کی مدح میں ہے کیونکہ بہادر شاہ نے ۱۸۴۲ء میں جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب دیا تھا اور متعلقہ رسمیں باقاعدہ ادا کی تھیں[1]

اس قصیدے میں لطافت خیال اور زور تخئیل سب سے زیادہ ملتا ہے ۔

۲ ۔ دوسرا قصیدہ دیوان میں " در مدح مسٹر ٹامسن صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر ممالک کے مغربی شمالی " کے عنوان سے درج ہے اور بیالیس صفحات پر مشتمل ہے ۔[2] اس قصیدے کا مطلع ہے ۔

صبح انفاسان کہ برخود آستین افشاندہ اند

صبح سان دستی بہ ملک ما وطن افشاندہ اند

اس قصیدے میں جستی اور زور کلام پایا جاتا ہے ۔

۳ ۔ یہ بائیس اشعار کا خطابیہ قصیدہ ہے ۔ بغیر کسی عنوان کے درج ہے ۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ۔

اے درت را کعبہ آسا مقصد جان دیدہ اند

وی مدیحت را چو مصحف جان ایمان دیدہ اند

اگرچہ اس قصیدے کی ابتدا میں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا ہے لیکن ممدوح کو ظل یزدانی کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا گیا ہے کیونکہ "ظل یزدانی" کا لفظ صرف بادشاہ کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے ۔

---

۱ ۔ سرکشی ضلع بجنور ، ص ۲۸

۲ ۔ مخطوطہ دیوان میں اکتالیس اشعار ملتے ہیں ۔ سا توان شعر نہیں ملتا ۔

مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصاید میں وہ خاقانی کے کلام سے متاثر تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

میچکاند خامۂ صہبائی از وصفت مدام

انچہ در میخانہ سر مست شروان دیدہ اند

مقطع میں خود ستائی کا عنصر بھی شامل ہے۔

٤۔ اے کہ فلک بحسن مہر ، ماہ ترست مشتری

مہر رخ ترا رسد ، بر رخ ماہ برتری

بہتر اشعار کے اس مندرجہ بالا طویل قصیدے میں ، جو مفتی آزردہ کی مدح میں کہا گیا ہے ، خاقانی کے قصاید جیسی شان و شوکت اور معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ قصیدے کے آخر میں جیسا کہ شعرا کی عادت ہوتی ہے خود ستائی بھی خوب کی ہے۔ ممدوح کی تعریف میں کہا گیا یہ شعر ممدوح کے نام کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

داور مہدی زمان ، حاکم ہادی سبیل

مفتی جار ملت و صدر جہان برتری

٥۔ ایک اور قصیدہ مفتی آزردہ کی مدح میں ملتا ہے جس کا مطلع ہے ۔

فنان ز ضعف کہ گر حال خود کنم تحریر

صریر خامہ بگوشم خلد بعنف چو تیر

اکثر اشعار کے اس قصیدے میں روانی و برجستگی پائی جاتی ہے قصیدے کے آخر میں اپنی تعریف میں کچھ شعر کہنے سے قبل کہتے ہیں ۔

اساس قلعۂ رنگین بمدح خویش نہم

کہ نیست اہل سخن را ازین مقولہ گریز

صبا چو رو بسو باغ و بوستان آورد

ز نو بهار نوید باین و آن آورد

۶ـ ز گنجدان قدر آسمان ز قسمت خلق

بقدر وسعت هر ظرف در میان آورد

مندرجه بالا قصیده ستائش اشعار پر مشتمل ثامسین صاحب کی مدح مین دوسرا قصیده هے تشبیب خوبصورت هے ـ حسن تخلص خوب هے ـ یه قصیده بهی حسن کلام کا نمونه هے ـ

۷ـ ایک اور قصیده " در مدح مرزا فتح الملک بهادر ولیعهد شاه دهلی " کے عنوان سے رساله نادره کے آخر مین (کلیات صهبائی جلد اول صفحه ۶۲۸) ملتا هے دوسرے قصاید کے ساتهه دیوان مین شامل نهین هے ـ قصیده کا پهلا شعر هے ـ

اے ضمیرت برتو فگن برمکان آفتاب

جسم پاکت نور بخش جان آفتاب

آفتاب کی ردیف سے قصیدے مین شان اور حسن پیدا هوگیا هے ـ قصیدے مین ۲۹ اشعار هین آخر کے دعائیه اشعار مین مبالغه ملتا هے ـ

بر در ایوان او بادا ملازم روز و شب

پرده دار آسمان و پاسبان آفتاب

باد خاک آستان و ذره خاک رهش

همرکاب آسمان و همعنان آفتاب

ان کے مندرجه بالا قصاید سے ظاهر هوتا هے که غزلیات کے مقابلے مین ان کے

قصاید زیادہ بلند اور اہمیت کے حامل ہین ۔ مجموعی طور پر ان کے قصاید مین زور کلام اور بندشون کی چستی پائی جاتی ہے ۔ اگرچہ قصاید کی تعداد بہت کم ہے لیکن جتنے بھی ہین ان مین بلندی ٔ فکر ، الفاظ کی شان و شوکت ، تراکیب کی ندرت اور تعلی کا انداز ملتا ہے ۔ قصاید مین مبالغے کا عنصر ہم کو ہر دور کی شاعری مین نظر آتا ہے اس لئے یہ خصوصیت محاسن کلام مین شامل ہے نہ کہ معائب مین ۔

جیسا کہ روایت چلی آرہی ہے کہ شاعر قصیدون مین ممدوح کی مدح کے ساتھ خود ستائی سے بھی باز نہین رہتا ۔ صہبائی کے یہان بھی خود ستائی کا عنصر شامل ہے ۔ مثلاً بہادر شاہ ظفر کی مدح مین جو قصیدہ ہے اس کا ایک شعر ہے

می چکاند خامہ ٔ صہبائی از وصفت مدام

انچہ در میخانہ ٔ سرمست شروان دیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ لوگون نے شروان کے سرمست مراد خاقانی شروانی کے میخانے مین جو کچھ دیکھا ہے ، صہبائی کا قلم تیری شان مین اس کی ریزش کرتا ہے یعنی صہبائی کا قلم خاقانی کے میخانہ ٔ کلام سے شراب کی مستی لیکر بکھیرتا ہے ۔ کہنا یہ چاہتے ہین کہ میرا کلام بھی خاقانی کے کلام سے کم نہین ۔ ان کے اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قصیدہ گوئی مین وہ خاقانی کے کلام سے متاثر تھے اور خود کو ان کے میخانہ سے فیضیاب تصور کرتے تھے ۔

مفتی آزردہ کی مدح مین جو دو قصیدے ہین ان مین دوسرے قصیدون کے مقابلے مین زیادہ شان و شوکت ، زور تخئیل اور جوش و اثر پایا جاتا ہے ۔

مثنوی ۔

مثنوی کی صنف بہت قدیم ہے اس کا آغاز تقریباً ایران مین فارسی شاعری

کے آغاز سے ہوتا ہے ۔ چونکہ مثنوی میں قافیے کی قید نہیں ہوتی اور اس میں کسی ایک مضمون کو تفصیل سے بیان کیا جاسکتا ہے اس لئے اس صنف میں زبان اور بیان کے اعتبار سے کافی گنجائش ہوتی ہے ۔ متنوع مضامین و مطالب کی ادائیگی کے لئے مثنوی کا میدان کافی وسیع ہے ۔ چنانچہ صہبائی نے بھی دوسرے شعرا کی طرح مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھیں جیسے حمد ، نعت ، مناجات ، مدح بادشاہ وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود ان کے دیوان میں کوئی مثنوی شامل نہیں ۔ یہ سب مثنویاں ان کی نثری تصانیف میں بکھری ہوئی ہیں ۔ ان کی مثنویاں مختصر ہیں اور زیادہ تر ان کے رسالوں کے آغاز یا اختتام پر یا تقاریظ وغیرہ میں ملتی ہیں ۔ بہادر شاہ کی مدح میں جتنی مثنویاں ہیں وہ مختلف عنوانات سے ان کی تصنیف " ریزۂ جواہر " میں شامل ہیں ۔

ان کی ایک مثنوی " دمغ الباطل " بھی ملتی ہے جو کلیات میں شامل نہیں ۔[1] ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل بہادر شاہ ظفر کے بارے میں یہ افواہ اڑی تھی کہ انھوں نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا ہے ۔ اس سلسلے میں کئی مثنویاں لکھی گئیں ۔ غالب نے بھی شاہ ظفر کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی ۔ صہبائی نے بھی ان میں سے کسی مثنوی کے جواب میں اپنی مثنوی "دمغ الباطل" لکھی تھی ۔ یہ اس افواہ کی تردید میں لکھی گئی تھی ۔ اس میں تقریباً ایک ہزار شعر ہیں ۔ دمغ الباطل ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵٤ء میں دہلی کے افضل المطابع سے شایع ہوئی تھی ۔ اور اب نایاب ہے ۔ صہبائی نے مثنوی میں بامعنی تراکیب اور چست بندشوں

---

۱ ۔ دمغ الباطل کے بارے میں خواجہ حامد نے صہبائی پر اپنی کتاب " امام بخش صہبائی " میں کچھ تفصیلات دی ہیں ان کو بھی اس کے متعلق اطلاعات پروفیسر سید نیر مسعود رضوی سے حاصل ہوئی تھیں ۔

۲ ۔ امام بخش صہبائی ، ص ۲۵۵ ، ۲۵٤

کا استعمال کیا ہے جس سے اس کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ علاوہ ازین صنایع لفظی و معنوی کا مناسب استعمال بھی ان کے اشعار مین پایا جاتا ہے۔ جس سے خوبی کلام بڑھ جاتی ہے مجموعی طور پر ان کی مثنویان جن کے اشعار کی تعداد ۶۰۰ سے اوپر ہے، دلاویز اور خوبصورت ہین۔ مثلاً اپنی تصنیف "ریزۂ جواہر" کی ابتدا مین ۳۳ اشعار کی مثنوی خدا کی حمد مین کہی ہے جو بڑی پر اثر ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر درج کر رہے ہین۔

" بیا ای خامہ فکر حمد کن ساز
طراز آستین صفحہ پرداز
خداوندا لقایت می پرستم
بدہ جام می وحدت بدستم
خروشم از نگاہ التفات ست
جنونم ذات و مستیہا صفات ست
دل من بسمل آہنگ شوق ست
فغان و نالہ مست جام ذوق ست
کہ اندر خلوت آئینہ خانہ
بود یک اصل و صد صورت بہانہ [1]

ایک اور جگہ لکھتے ہین ـــ

" خامۂ من مائدہ آراست ست
گرسنگان را بدعا خواست ست
خامۂ من چون کند انشای نثر
سبزۂ فردوس دمد جای نثر

۱ـ کلیات صہبائی، ص ۶، ۷

آنکه درین شرح سخن گفته ام

گوهر رازی دگری سفته ام

هرچه دمد در چمن هر خیال

از لب نطقم بنماید جمال

مندرجه بالا اشعار سے قاری خود سمجھ سکتا ہے کہ ان کی مثنویاں سادہ روان اور دلکش ہین ۔ طرز ادا بھی دلنشین ہے ۔

رباعیات ۔

اگرچہ دیوان مین صرف گیارہ رباعیان ہی شامل ہین لیکن نثر کے درمیان جو مختلف اشعار ملتے ہین ان مین رباعیون کی تعداد کافی ہے ۔ ان کی بیشتر رباعیان حمد ، نعت اور منقبت کے علاوہ زیادہ تر ہندو مسلم تہوارون پر ہین ۔ مثلاً عید الفطر ، عید الضحی ، شب برات ، ہولی ، راکھی ، بسنت وغیرہ ۔ ذیل مین نمونے کے طور پر ان کی دو رباعیان " عید " اور " ہولی " پر پیش کی جارہی ہین ۔

" عید ست و دل زمانہ را عیش تمام

ارباب طرف گزیدہ ہر سو بخرام

بی دیدن آن ہلال ابرو لیکن

مارا چہ خبر طرب چہ و عید کدام

رنگے کہ پرد ز چہرۂ عاشق زار

اشکے کہ چکد ز چشم ہر سینہ فگار

در ہولی ما کہ نام آن جوش جنون ست

افشان گلال و رنگ بازی است بکار

ان کی رباعیات مین کوئی خاص قابل ذکر بات نہین ۔ غزلیات اور قصاید کے مقابلے مین اسے کوئی مقام نہین دیا جاسکتا ۔ یون بھی ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ البتہ نثر مین جو رباعیان آئی ہین وہ نسبتاً زیادہ اچھی اور بامعنی ہین جیسے

" از بندہ خضوع والتجا می زیبد
بخشائش بندہ از خدا می زیبد
گر من کنم آنکہ آن ز من نازیباست
تو کن ہمہ آنکہ آن ترا می زیبد ۔[1]

دریاد توام ز دیدہ طوفان ریزد
وز شور و فغان ز دل قیامت خیزد
اے ابر کرم تو مشت آبی بزنی
ور نے این آہ آتشے انگیزد ۔[2]

فن معما پر کچھ رباعیات " رسالہ جواہر منظوم " کے عنوان سے کلیات صہبائی (جلد اول) مین ملتی ہین ۔ دراصل یہ تیس صفحات کا ایک منظوم رسالہ ہے جس مین ایک سو تیس رباعیان اور ایک قطعہ ہے ۔ کچھ رباعیان مصنف کے نام ، تخلص اور تاریخ تصنیف پر ہین باقی سب صنعت معما پر کہی گئی ہین ۔ ان رباعیون سے خدا کے ننانوے نامون کا استخراج ہوتا ہے جن مین پہلی رباعی ۔۔ سے اسم " اللہ " اور آخری سے اسم " صبور " برآمد ہوتا ہے ۔ اس مین صہبائی نے میر حسین نیشاپوری مشہور معمائی کا تتبع کیا ہے ۔ خدا کے ننانوے نامون پر میر حسین کی رباعیان بھی ہین ۔[3]

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، جلد اول ، ص ۱۱٤
۲ ۔ ایضاً ص ۱٦٦
۳ ۔ امام بخش صہبائی ، ص ۲۵۳

قطعات اور مخمس ـ

مثنوی کے اشعار کی طرح صہبائی کے قطعات بھی ان کے دیوان مین شامل نہین ـ بلکہ ان کی نثری تخلیقات مین منتشر ہین یا پھر وہ قطعے ہین جو کسی کی تاریخ پر لکھے گئے ہین ان مین سے زیادہ تر خود ان کی تصانیف کی تاریخ تصنیف پر کہے گئے ہین مثلاً اپنی تصنیف شرح سہ نثر کے اختتام پر یہ قطعہ ملتا ہے ـ

" شرحی کہ ہر سہ نثر ظہوری ز خامہ ریخت
در دی ہزار نکتہ بہرباب گفتہ شد
از بہر سال او زدہ ہاتف ندا ز غیب
شرح سہ نثر خالی از اطناب گفتہ شد ـ[1]

ایک اور قطعہ مین علم و ہنر کی بے قدری کا شکوہ کرتے ہین ـ

افسوس چہ نغمہا سرودم بعبث
واندر خم و پیچ راہ بودم بعبث
اکنون ہمہ لب بعذر آن بکشایم
زین پیش اگرچہ لب کشودم بعبث ـ[2]

صہبائی کے کلام مین دو مخمس بھی شامل ہین ـ ایک ان کے دیوان مین شامل ہے یہ شوکت بخاری کی ایک غزل پر تضمین ہے ـ شوکت بخاری کا مطلع ہے ـ

خط رخت نقاب رخ را ز شد مرا
برگ بنفشہ سرفہ آواز شد مرا

صہبائی کی تضمین چھ بندون پر مشتمل ہے ـ

۱ـ کلیات صہبائی ، ص ۱۰۸
۲ـ ایضاً ص ۲۲۰

ای قامت تو سرو سر افراز شد مرا　　لعلت ز راز پرده بر انداز شد مرا

زلف تو در شکستگی انباز شد مرا　　خط رخت نقاب رخ راز شد مرا

برگ بنفشه سرمهٔ آواز شد مرا [1]

دوسرا مخمس قدسی کی مشہور نعتیہ غزل پر تضمین ہے۔ قدسی کا مطلع ہے

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت کہ عجب خوش لقبی

صہبائی نے اس پر نو اشعار مین ایک مخمس لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

این طرب کز پی است تو شفاعت طلبی

بر لب رحمت حق خندہ بود زیر لبی

نسبت عرش بجاہ تو بود بے ادبی

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت کہ عجب خوش خلقی [2]

غزلیات۔

صہبائی کے دور مین فارسی شاعری روایت کے دائرے مین ہی تھی۔ یعنی اصناف سخن اور ان کے موضوعات بغیر کسی ترمیم و تبدل کے وہی تھے جو مدت سے چلے آرہے تھے۔ وقت کے ساتھ کچھ کمی و بیشی ضرور ہوئی تھی مثلاً شاعری کے آغاز مین اصناف شاعری مین مثنوی کو بہت مقبولیت حاصل تھی چونکہ اس وقت قومی کارنامون کو زندہ رکھنے کے لئے رزمیہ مثنویان لکھی جاتی تھین۔ پھر عشقیہ اور صوفیانہ مثنویان بھی لکھی جانے لگین۔ جیسا کہ قبلاً کہا گیا کہ مثنوی کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس مین اظہار خیال و بیان کے لئے بہت گنجائش رہتی ہے چنانچہ عشقیہ ،

۱۔ کلیات صہبائی ، جلد اول ، ص ۲۹۷

۲۔ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصہ دوم ، ص ۱۹۳

رزمیہ اور اخلاقی نیز صوفیانہ عقاید کے اظہار کے لئے اس صنف سے بہتر کوئی صنف نہین ۔ چنانچہ ایک وقت تھا جب دوسری اصناف کے مقابلے مین مثنوی کو بہت عروج حاصل تھا ۔

اس کے بعد جب شعر و شاعری کا چرچا شاہانہ دربارون مین ہونے لگا اور شعر و ادب کو بادشاہون کی سرپرستی حاصل ہوگئی تو قصیدے کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ اس وقت مثنوی کے دوش بدوش قصیدے کی صنف بھی ترقی کرنے لگی ۔ اس کا یہ مطلب نہین کہ دوسری اصناف مین طبع آزمائی ہی نہ کیجاتی تھی بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسری اصناف کے مقابلے مین قصیدے کی صنف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی ۔ اس کے علاوہ دوسری اصناف سخن مین بھی اکثر و بیشتر طبع آزمائی کی جاتی تھی ۔ دورۂ متوسطین یعنی " سبک عراقی " کے تحت غزل کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوگئی ۔ سعدی اور حافظ نے اس صنف کو معراج پر پہنچایا اور غزل کو مقبول خواص و عوام بنایا ۔ دورۂ متاخرین مین اگرچہ دربار مین شعرا کی خوب قدر دانی اور حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور وہ دربار مین قصاید پڑھ کر خوب انعام و اکرام حاصل کرتے تھے، اس کے باوجود قصیدے کی صنف کو وہ عروج اور مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو اس سے قبل کے ادوار مین نظر آتی ہے ۔ اس کے مقابلے مین صنف غزل کی مقبولیت اور شہرت دورۂ متاخرین مین اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور اس نے مرکزی حیثیت حاصل کرلی ۔ یہی وہ وقت تھا جب " سبک ہندی " کی روایت زورون پر تھی ۔ لہذا صنف غزل مین بھی سبک ہندی کی خصوصیات جگہ پانے لگین ۔

یہی وہ دور تھا جب صہبائی ایک شاعر کی حیثیت سے دنیائے ادب مین روشناس ہوئے ۔ صہبائی نے ایک مختصر دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے جس مین اکسٹھ غزلین ملتی ہین اور جن کی کل تعداد ایک ہزار اشعار بھی نہین ۔ چونکہ

صہبائی اپنی نثر و نظم مین " سبک ہندی " یا " طرز بیدل " کی تقلید کرتے تھے ۔ اس لئے ان کی غزلیات مین قریب قریب وہ تمام خصوصیات ملتی ہین جو دورۂ متاخرین یا سبک ہندی کے شعرا کے وہان پائی جاتی ہین ۔ جیسا کہ قبلاً کہا گیا کہ دورۂ متاخرین مین غزل کی صنف کو بہت ترقی ہوئی ۔ ترقی سے مطلب یہ ہے کہ "سبک ہندی" کے شعرا نے غزل مین نہ صرف تخیل و افکار کا دائرہ وسیع تر کردیا تھا بلکہ طرز بیان مین بھی کچھ جدتین پیدا کی تھین ۔ اب غزل کے موضوعات صرف عشق و عاشقی یا واردات قلبی تک ہی محدود نہ رہ گئے تھے بلکہ ان مین فکر و فلسفے کی آمیزش شروع ہوگئی تھی ۔ شاعری مین جدت خیال اور جدت ادا پیدا کرنے کے لئے نئی نئی تشبیہات و استعارات اور تراکیب کا استعمال کیا جانے لگا تھا ۔ اس کے علاوہ مختلف صنعتون کے استعمال سے بھی تزئین کلام کی کوشش کی جاتی تھی ۔ فکر و فلسفے کی آمیزش کے ساتھ ندرت خیال و ندرت بیان نے مل کر اگر ایک طرف غزل کے دامن کو کشادہ تر کیا تھا تو دوسری طرف غزل کی رومانیت اور سرشاری کو بھی کم کردیا تھا ۔

مجموعی طور پر صہبائی کی غزلیات مین بھی کم و بیش وہی خصوصیات پائی جاتی ہین جو سبک ہندی کے ماننے والے شعرا کے یہان نظر آتی ہین ۔ خیال بندی مضمون آفرینی ، ایہام ، مبالغہ ، دور ازکار تشبیہات و استعارات، ندرت تراکیب ، ان کی غزلیات کی نمایان خصوصیات ہین ۔ دقت آفرینی اور دور از کار خیالات کے زیر اثر کلام مین وہ تاثیر و جوش نہین جو ان کے ہم عصر مشہور و معروف شاعر غالب کے یہان ہم کو نظر آتا ہے ۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ کچھ مدت کے بعد غالب " طرز بیدل " سے منکر ہوگئے تھے لیکن صہبائی تا دم آخر حدود بیدل سے باہر نہ نکل سکے تھے ۔

دورۂ متاخرین کی غزل مین روایتی موضوعات یعنی عشقیہ جذبات اور دلی واردات کے اظہار کے ساتھ دوسرے موضوعات یعنی فکر و فلسفہ ، تصوف اور اخلاق کے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا جانے لگا تھا ۔ اب شاعری یعنی غزل جذبات کے دائرے سے نکل کر تعقل اور تفکر کی منزلین طے کرنے لگی تھی ۔

اس کے علاوہ چونکہ غزل کے روایتی مضامین اور موضوعات اب کافی فرسودہ ہوچکے تھے اس لئے اس کو بیان کرنے کے لئے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کیجاتی اور ندرت فکر و جدت بیان و ادا کو بروئے کار لایا جاتا ۔ صہبائی کے وہان بھی غزل مین یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہین ۔ ان کی غزل مین عشقیہ شاعری کا بھی روایتی انداز ملتا ہے ۔ غزل مین مضمون کے اعتبار سے ان کے یہان عشق و محبت کے جذبات بھی ہین اور غم روزگار کی حکایتین بھی ۔ کہین کہین فلسفہ اور اخلاق کے مضامین بھی ملتے ہین ۔ محبوب کے زلف و عارض کی کہانی بھی ملتی ہے اور جذبۂ عشق حقیقی بھی ۔ زمانے کی بے اعتنائی کی شکایت بھی ہے اور محبوب کی بے رخی کا شکوہ بھی ۔ غرض ان کے دیوان کے اختصار کو دیکھتے ہوئے ان کے کلام مین گوناگون مضامین کا استعمال کبھی کبھی قارئین کو ورطۂ حیرت مین ڈال دیتا ہے ۔ غزل مین روایتی انداز ہوتے ہوئے بھی ، ان کے شاعرانہ تخیل کی پرواز بہت اونچی ہے ۔ غزل مین کبھی کبھی عشقیہ جذبات کو بڑے دل نشین انداز مین بیان کیا گیا ہے ۔ ان کی غزلون مین تازہ مضامین کی بھی کمی نہین ۔ ذیل مین چند مخصوص مضامین پر ان کے کچھ اشعار دئے جارہے ہین ۔

عشق حقیقی ـ

هر زره جلوه گاه رخ آتشین اوست
صد مشرق ست سر زدن آفتاب را
نگاه منتظر و دل بجستجو نالان
جهان خراب می جلوهٔ ندیدهٔ کیست
گاه به نیم ناز برد گاه بیك کرشمه دل
حسن جهان فریب او ملك بساحری گرفت

بے ثباتیٔ کائنات ـ

چون شرر حاصل ما در گرو دست فناست
برق باریشه کند سر بدر از دانهٔ ما
محو نگارخانهٔ نیرنگ می کند
طرز فنا و هستی عالم حباب را

شکوه و ناقدری زمانه ـ

صهبائی از زمانه درین گوشهٔ خمول
خونها گریستم و کسے را خبر نشد
روز مرا صد ظلمت شبهای غم در آستین
صبح مرا صد کلفت شام غریبان در بغل

فلسفه و تصوف ـ

عقل می نازد و از سر یقین آگه نیست
نسخهٔ جهل بود مبحث فرزانهٔ ما
حیرت دل پرده پوش روی کیست
جلوه ها شد رونما آئینه را
هزار جلوه درین پرده و ندانستم
تو در کناری و شد جان در انتظار مرا

عشق و محبت و آه و زاری ـ

جلوه بر خود غلط و عشق نظر باز غیور
شمع داغ ست ز خود داری پروانهٔ ما
کن آشنای لب دوسه حرف عتاب را
از بهر ما دو آتشه ساز این شراب را
درد ل توئی طپیدن دل اضطراب تست
زنهار ره مده بدلم اضطراب را
ز دوست منع دل بیقرار نتوان کرد
نه صبر در دل و نی بردل اختیار مرا
شب هجران و دل در اضطراب تست شکوها برلب
بیا ای جان جان کین خسته چشمی سوئے در دارد

یون تو صہبائی نے اکثر غزلین مشہور اساتذہ کی معروف زمینون مین کہی ہین لیکن یہان مثال کے طور پر دو تین غزلون کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ مندرجہ ذیل غزل کی زمین بہت مشہور رہی ہے ۔ صہبائی کی غزل کے چند اشعار ہین ۔

دارم دل دیوانہ صد داغ ہجران در بغل
چشمی و چندین نسخۂ خواب پریشان در بغل

نازم بکافر لیکن کیشۂ زلف سیاہ کارش کہ او
ہم رہ ایمان میزند ہم کردہ قرآن در بغل

در سینہ آتش مشتعل در دیدہ دریا موج زن
ہر شعلہ دوزخ آفرین ہر موج طوفان در بغل

روز مرا صد ظلمت شبہای غم در آستین
صبح مرا صد کلفت شام غریبان در بغل

دیدم سحر صہبائے آشفتہ در میخانہ
ساغر بکف شعری بلب اوراق دیوان در بغل

مندرجہ بالا غزل صہبائی کی مشہور غزلون مین سے ہے ۔ اس غزل کی زمین خاصی مقبول رہی ہے ۔ چنانچہ صہبائی سے قبل قدسی مشہدی نے اسی زمین مین ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے ۔

دارم دلی اما چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
چشمی و خون در آستین اشکی و طوفان در بغل

اس غزل کا مقطع بہت مشہور ہوا تھا ۔

قدسی ندانم چون شود سودائے ما روز جزا
او جنس آمرزش بکف من نقد عصیان در بغل

اس کے بعد اٹھارھوین صدی کے مشہور فارسی کے عالم شاعر مولانا آزاد بالگرامی نے بھی اسی زمین مین غزل کہی تھی جس کا ایک شعر قدسی کے شعر کی طرح بہت مشہور ہوا

وہ شعر یہ ہے ــــ

روز قیامت ہر کسے در دست دارد نامہٴ

من نیز حاضر میشوم تصویر جانان در بغل

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر ہین جنھون نے اس زمین مین طبع آزمائی کی ہے ــ یہان جس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ قدسی مشہدی اور آزاد بلگرامی جیسے جید استادان سخن کی زمین پر طبع آزمائی کرنا اور پھر اس مین اچھے اشعار نکال لینا آسان کام نہین تھا ــ اس پس منظر مین جب ہم صہبائی کی غزل کو دیکھتے ہین تو ان کی شاعرانہ صلاحیت اور فنکارانہ مہارت دونون کا قائل ہونا پڑتا ہے ــ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کی روح ، شاعر کی قوت تخیل ہوتی ہے اگر اس مین کچھ جان نہ ہو تو زبان کی سادگی اور شیرینی ، الفاظ کا حسن ، تراکیب کی چستی ، نیز خوبصورت تشبیہات و استعارات سے بھی کچھ حاصل نہین ہوتا ــ بالفاظ دیگر شعر کی سب سے بڑی خوبی اس کی گہرائی ، معنویت اور خیال انگیزی رہی ہے جس کی بہترین مثال صہبائی کی مندرجہ بالا غزل کا یہ شعر ہے ــ

نازم بکافر کیشی زلف سیاہ کارش کہ او

ہم راہ ایمان میزند ہم کردہ قرآن در بغل

یہ شعر بظاہر حسن و عشق کے روایتی انداز مین لکھا گیا ہے جس سے معشوق کی سفاکی اور کرشمہ بازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی سیاہ کار زلفین لوگون کے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہی ہین لیکن انھین سیاہ کار زلفون کے سائے مین وہ پرنور اور تابناک چہرہ بھی نظر آتا ہے جسے دیکھ کر خالق عالم کی صناعی پر ایمان لانا پڑتا ہے اور اس طرح وہ چہرہ قرآن کریم کے مشابہ بتایا گیا ہے ــ لیکن

اس شعر کو محض اس کے عشقیہ مطلب تک محدود نہین کیا جا سکتا کیونکہ اس شعر کو پڑھتے ہی صہبائی کا زمانہ یاد آجاتا ہے جو انتہائی پر آشوب اور ایک جابر غیرملکی حکومت کے ظلم و ستم کا شکار تھا ۔ اس لئے یہ شعر اس وقت کی ظالم اور مکروہ فریب سے بھری ہوئی حکومت پر ایک نہایت کاری طنز معلوم ہوتا ہے وہ حکومت جو ایک طرف عوام کی فلاح و بہبود کی دعویدار تھی لیکن دوسری طرف وہ ہندوستانی عوام کا خون چوس رہی تھی اور پورے معاشرے کو اس نے اپنے پرفریب طرز عمل سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور مشہور زمین جس مین فارسی کے مشہور اساتذہ نے طبع آزمائی کی ہے " گناہ کیست " ہے ۔ اس مشہور زمین مین طبع آزمائی کرنے والے عرفی ، نظیری ، طائب اور قدسی وغیرہ تھے ۔ غالب اور صہبائی نے بھی ان کی پیروی مین اس زمین کا انتخاب کیا اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہین ۔ صہبائی کی غزل کے چند اشعار اس زمین مین یہ ہین ۔۔

کافر نگاہ دشنہ گزار از سپاہ کیست
در خون طپیدۂ بسمل من داد خواہ کیست

گفتی کہ میکشد دلم امشب بیکطرف
غیرت برم کہ جذبۂ بخت سیاہ کیست

این شبنم عرق کند از پاک دامنت
بیباک نرگس تو ندانم گواہ کیست

سنبل مرا بپہلو گل مے برد ز خویش
این طرہ سر کشادہ ز طرف کلاہ کیست

صہبائی ار بعشوۂ شوخی ندادہ دل
این اضطراب و چشم امیدے براہ کیست

غالب کے دو شعر مثال کے طور پر لکھے جا رہے ہین ۔

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناہ من

دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

مو برنتابد این همه پیچ و خم و شکن

زلف تو روزنامۂ بخت سیاہ کیست

اگرچہ صہبائی کی غزل کے چند اشعار اس زمین مین اچھے ہین لیکن غالب کے مرتبے کو نہین پہنچ سکے ہین ۔ صہبائی کے مقابلے مین غالب کے اشعار زیادہ پرلطف اور دلکش ہین ۔

" چند است ، پند است " کی زمین مین بھی غالب اور صہبائی کی غزلین ہین ۔ ان سے قبل علامہ شبلی نے شعرالعجم مین اس زمین مین عبدالرحیم خان خانان اور نظیری کی غزلون کا مقابلہ کیا ہے ۔ اور یقیناً " خان خانان کی غزل نظیری سے بڑھ کر تغزل کی چاشنی رکھتی ہے ۔ غالب کی غزل تو نظیری کے مقابلے مین پیش کی جا سکتی ہے لیکن صہبائی اس زمین مین سب سے پیچھے رہ گئے ہین ۔ یہ اور بات ہے کہ اس غزل مین چند شعر ان کے بھی اچھے اور دل نشین ہین مثلاً"

بشان حسن نگر کز کجا و تا چند است

که بنده گشته در رتبۂ خداوند است

بحیرتم که چو از من بمرگ راضی نیست

بزندگانیٔ دشمن چه گونه خرسند است

تبسم تو مگر آب داده شمشیرت

که زخم برتن عشاق در شکرخند ست

حیا نکرده روی در کنار صهبائی

همچو بندگری که بوصلت چه آرزو مند ست

اس کے علاوہ " پرچم شان " یا " ہمدم شان " کی ردیف میں بھی صہبائی اور غالب دونوں کی غزلیں ملتی ہیں ۔ صہبائی کی غزل کے دو اشعار ہیں ۔

روی خوبان چہ قدر غارت دلہاست کہ ہست
صبح صد فتنہ برآید ز شب پرچم شان

دل جدا می‌تپد از غم از درد جدا
کی دہد دست کہ فارغ شوم از ماتم شان

غالب کے اسی زمین میں دو شعر یہ ہیں ۔

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شان

دونوں کی پوری غزلوں کا اگر مقابلہ کیا جائے تو غالب اور صہبائی کی شاعری کا فرق صاف نظر آجائے گا ۔ غالب کے وہاں روانی، برجستگی، بندشوں کی چستی اور طرز ادا کی جدت پائی جاتی ہے تو صہبائی کے وہاں بھی اگرچہ تازہ مضامین معنی آفرینی اور تخیل کی کمی نہیں لیکن غالب کی جیسی روانی اور برجستگی بھی نہیں ملتی البتہ کہیں کہیں انداز بیان دلکش اور دلنشین ضرور ہے ۔ دراصل صہبائی کے یہاں تشبیہات، استعارات، تراکیب اور اسی قسم کی دوسری فنی خصوصیات کے استعمال نے ان کے کلام کو پیچیدہ اور دقیق بنا دیا ہے ۔

صہبائی نے اپنے کلام میں اکثر مشکل ردیفوں کا بھی انتخاب کیا ہے ۔ جیسے چنین باشد، آفرین باشد، آشنا ہنوز، مپرس، در بغل اور گریستم وغیرہ

ان مشکل ردیفون مین پوری غزل مین خوبصورتی اور معنویت تلاش کرنا تو لاحاصل ہے البتہ اگر دو چار شعر بھی اچھے نکل آتے ہین تو وہ بھی بڑی بات ہے ۔ کیونکہ مشکل ردیفون مین اچھے اشعار نکال لینا آسان کام نہین ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صہبائی نے استادان فن کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور حسب ضرورت اس سے استفادہ بھی کیا تھا ۔

ان کی غزلیات کو پڑھنے کے بعد ان کے کلام مین تصنع اور آورد کا عنصر صاف نظر آجاتا ہے ۔ چنانچہ ان کی غزلیات کو پڑھنے سے دل و دماغ کو وہ فرحت و تازگی نہین ملتی جو ایک اچھے شعر کو سننے کے بعد حاصل ہوتی ہے ۔ دراصل ایک اچھے شعر کی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد قاری کی روح مین بالیدگی اور طبیعت مین انبساط پیدا ہو ۔ اس کے برعکس صہبائی کا کلام ، جو مشکل تشبیہون نئی نئی تراکیب ، دقیق خیال و معنی سے عبارت ہے اس کے معنی و مطالب کو سمجھنے کے بعد " صرف ویسی خوشی ہوتی ہے جیسے کسی ریاضی کے سوال کو حل کرنے کے بعد "۔[1]

اب صہبائی کے کلام کا بطور مجموعی جایزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیات پر مجملاً بحث کی جائے گی ۔

اچ صہبائی کے کلام مین صنائع لفظی و معنوی کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے ۔ اگر ایک طرف ان کا مناسب استعمال شعر کو خوبصورتی بخشتا ہے تو دوسری طرف ان کی زیادتی شعر کو مبہم اور بوجھل بھی بنا دیتی ہے ۔ چنانچہ صہبائی کے وہان صنعتون کے التزام سے کبھی شعر مین حسن پیدا ہوا ہے تو کبھی ان کی فراوانی سے کلام پھیکا اور بے لطف بھی نظر آتا ہے ۔ شعر مصنوع

---

۱ ۔ مسالک و منازل ، ص ۳۹۵

کی یہ روایت " سبک ہندی " کی دین تھی ۔ صہبائی چونکہ " سبک ہندی " کے ماننے والے تھے اس لئے وہ سبک ہندی کی فی الجملہ خصوصیات کو بعینہ اپنے کلام میں اپنا لیتے ہیں ۔ ان کی توجہ بیشتر آرائش لفظی ، پرپیچ تراکیب اور پرتکلف طرز تحریر کی طرف رہتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قاری شعر کی ظاہری آرائش و بناوٹ میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ اصل معنی کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے ۔ غالباً " اس زمانے میں اس قسم کا کلام شاعر اور قارئین دونوں کے ذوق شعری کی تسکین اور تفنن طبع کا سامان فراہم کرتا تھا ، طبیعت میں انقباض نہیں* جیسا کہ آج کا قاری اس قسم کے شعر کو پڑھ کر محسوس کرتا ہے ۔

۲۔ ایک اور خاص چیز جو ان کے کلام میں ملتی ہے وہ کثرت سے اضافتوں کا استعمال ہے ۔ ایک ایک مصرعے میں تین تین چار چار اضافتوں کا استعمال ان کے اشعار میں عام طور پر نظر آتا ہے ۔ وہ اضافتوں کے بکثرت استعمال سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ صنعتوں اور اضافتوں کے کثرت استعمال سے سادگی اور سلاست شعر میں کمی کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ اور اس کی جگہ کلام میں تصنع اور پرکاری غالب آجاتی ہے مثال کے طور پر

سختی کاهیدن تن نذر تعظیم غم است

استخوان صرف غزل شد میہمان عشق را

یا

دارم دل دیوانۂ صد داغ ہجران در بغل

چشمی و چندین نسخۂ خواب پریشان در بغل

۳۔ صہبائی کے کلام میں " ایجاز " یعنی اختصار نویسی کی خصوصیت بھی ملتی ہے ۔

یعنی ایک وسیع مضمون کو مختصر الفاظ مین ادا کرتے ہین ۔ دراصل "سبک ہندی" کی ایک خصوصیت اختصار نویسی بھی تھی یعنی جو خیال یا مضمون کئی شعر مین ادا ہونا چاہئے اس کو ایک شعر مین ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ وسیع مطالب کو مختصر الفاظ مین ادا کرنے سے کلام نہ صرف دقیق اور دور از فہم ہوجاتا تھا بلکہ کلام کا حسن اور لطافت بھی ختم ہوجاتی تھی ۔ بلا شبہ اس کا استعمال اگر اعتدال کے ساتھ کیا جائے تو معنوی اعتبار سے اس مین بلندی اور وسعت پیدا ہوجاتی ہے ۔ لیکن کبھی کبھی حد اعتدال سے زیادہ "ایجاز بندی" کلام کو معمہ بھی بنا دیتی ہے ۔

اس خصوصیت کا موجد فغانی تھا لیکن ہندوستان مین بالعموم سبک ہندی کے مقلد شعرا کے وہان اور بالخصوص بیدل کے کلام مین اس کا استعمال بکثرت ملتا ہے سبک ہندی کے دوسرے شعرا کی طرح صہبائی کے کلام مین بھی کہین کہین اس کا استعمال ملتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ صہبائی کے کلام مین کسی قسم کا حسن یا کشش نہین ۔ سبک ہندی کی ان تمام خصوصیات کو برتنے کے باوجود ، ان کے مختصر دیوان مین کافی تعداد ایسے اشعار کی ہے جو نہ صرف مضمون بلکہ طرز ادا کے اعتبار سے بھی اہم اور دلنشین ہین ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کا فارسی کلام بہت جاندار اور ایک حد تک معیاری ہے ۔ ان کے کلام مین استادانہ رنگ پایا جاتا ہے ۔

اگرچہ صہبائی کی شاعری فلسفیانہ گہرائی ، بلندیٔ فکر اور معنویت سے بھرپور نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس مین جوش و تاثیر کی کمی ہے ۔ اس کی وجہ غالباً "دقیق خیالات، مشکل مضامین ، مشکل الفاظ اور صنایع بدایع کا استعمال ہے ۔ جو ان کے کلام مین جابجا نظر آتا ہے ۔ تاہم ان کے کلام کا خاصا حصہ ایک امتیازی

حیثیت رکھتا ہے ۔ ذیل میں صہبائی کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جس سے پڑھنے والے ان کے کلام کی خوبصورتی اور معنویت کا اندازہ خود کرسکیں گے ۔

مست دریا کش عشقیم و بمیخانۂ شوق
جرعۂ زد لب منصور ز پیمانۂ ما

صہبائیا بوسعت رحمت نگاہ کن
یکسو بنہ شمار گناہ و ثواب را

مپسند غرہ بر رخ خود ماہتاب را
یکشب بیا ز چہرہ برافگن نقاب را

در دل توئی طپیدن دل اضطراب تست
زنہار رہ مدہ بدلم اضطراب را

کن آشنای لب دو سہ حرف عتاب را
از بہر ما دو آتشہ ساز این شراب را

لبریز حرف شکوۂ دلدار میروم
خواہم دراز مدت روز حساب را

ہر ذرہ جلوہ گاہ رخ آتشین اوست
صد مشرق ست سرزدن آفتاب را

بسکہ در یاد دہان نوش خندش میکشم
زہر ہم در ساغر ما می شود تریاک ما

دوش رحمی در ضمیر آن بت کافر گذشت
با رقیبی گفت کو صہبائی غمناک ما

بیر پرده است روی تو امروز در چمن

نتوان گرفت منت آتش گلاب را

دارد اثر ز چین جبین موج خنده است

یک رنگ کرده ناز تو لطف و عتاب را

حیا نکرده روی در کنار صهبائی

چو بنگری که بوصلت چه آرزو مند ست

ز کس یا رب علاج درد هجرانم نمی آید

شدم خاک و هنوز آن برق جولانم نمی آید

چو دیدم غالب و آزرده را از هند صهبائی

بخاطر هیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

دیدم سحر صهبائی آشفته در میخانه

ساغر بکف شعر بلب اوراق دیوان در بغل

همچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم

محرم خورشید گشتم با خسان کم ساختم

مردم و در چشم مردم عالمی تاریک شد

من مگر شمعم چو رفتم بزم برهم ساختم

مندرجه بالا اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ کلام مین بیشتر " سبک ہندی " کی خصوصیات کو برتنے کے باوجود ان کے یہان دلنشین اور آسان فہم اشعار کی کمی نہین کہین کہین کلام مین نزاکت خیال اور حسن تغزل بھی ملتا ہے جو فارسی کے اکثر دیگر شعرا کے یہان نظر آتا ہے ۔ اس بات کو اکثر اہل نظر نے بھی محسوس کیا ہے ۔ چنانچہ

چنانچہ فارسی کے مشہور عالم استاد ضیاء احمد بدایونی اپنے ایک مضمون میں صہبائی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

" ۔۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو زبان و بیان پر کامل قدرت ہے اور کلام پختہ اور استادانہ ہے ۔۔۔۔ "[۱]

پروفیسر سمیع الدین احمد اپنے ایک مضمون میں ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——

" صہبائی کا شعری مجموعہ مختصر ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے حسن انتخاب کا درجہ رکھتا ہے اور کلام بحیثیت مجموعی ایک خاص کیفیت اور مزاج سے خالی نہیں "[۲]

مولانا امداد صابری صہبائی کے بارے میں لکھتے ہیں ——

" شعر و سخن میں بھی وہ نام پیدا کیا کہ نوعمری میں مرزا قتیل فریدآبادی کے ہم پایہ سمجھے جانے لگے ۔۔۔۔ "[۳]

پروفیسر وارث کرمانی صہبائی کو غالب کے بعد دوسرا بڑا شاعر مانتے ہیں ——

" As a poet Sahbai was second only to Ghalib in his time. His collection of Persian poems, though small in size, reveals stirling qualities of thought and expression to which his scholarship added lustre ...."[۴]

۱ــ مسالک و منازل ، ص ۳۶۰
۲ــ غالب نامہ ، جنوری ۱۹۸۴ء ص ۹۲
۳ــ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا ، ص ۲۶۰
۴ــ ڈریمس فار گوٹن ، ص ۴۰۱

(بحیثیت شاعر صہبائی غالب کے بعد اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے ۔ ان کا فارسی کلام اگرچہ کمیت مین کم ہے لیکن اس مین فکر و فن دونون کی اچھوتی خوبیون کا احساس ہوتا ہے ۔ جسے ان کی علمیت نے اور بھی چمکا دیا تھا "۔)

ممکن ہے کہ صہبائی کو غالب کے بعد اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر کچھ لوگ اتفاق رائے نہ کرین لیکن اگر وہ صہبائی کے دیوان کا بغور مطالعہ کرین تو یقینا" صہبائی کی شاعرانہ فوقیت اور ان کے خوبصورت انداز غزل سرائی کو ماننے پر اپنے کو مجبور پائین گے ۔

مجموعی طور پر وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے ۔ زبان و بیان پر ان کو یکسان طور پر قدرت حاصل تھی نیز ان کے کلام مین پختگی اور انداز بیان مین دلکشی بھی ملتی ہے ۔ مضمون آفرینی اور حد سے زیادہ صنعت کاری نے ان کے کلام مین کہین کہین بے اعتدالی ضرور پیدا کردی ہے جس سے ان کے اشعار مین فطری حسن کی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔ تاہم یہ بے اعتدالی ان کے تمام اشعار کی دامن گیر نہین ہوتی ۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری روایتی ہوتے ہوئے بھی انفرادی طرز کی مالک ہے ۔ ان کی شاعری مین " سبک ہندی " کی فی الجملہ خصوصیات ہونے کے باوجود ، شاعرانہ لطافت اور معنی کی گہرائی پائی جاتی ہے ۔

جیسا کہ قبلا" کہا گیا کہ وہ فطرتا" شاعر نہ تھے بلکہ شوقیہ یا ضرورتا" شعر کہا کرتے تھے اس لئے ان کے کلام مین وہ جوش و تاثیر نہین جو اس عہد کے دوسرے شعرا بالخصوص غالب کے وہان ہم کو نظر آتا ہے ۔ یہی سبب تھا کہ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہوسکا جو ان کے ہم عصر شعرا کو ، اگرچہ وہ سب علم و فضل کے اعتبار سے ان سے کم تھے ، حاصل ہوا ۔ تاہم ان کے فارسی کلام کو بحیثیت مجموعی پسندیدگی کا درجہ دیا جاسکتا ہے ۔

صہبائی کی شاعرانہ اہمیت۔

صہبائی کی شاعرانہ اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہر مشاعرہ اور محفل سخن میں خواہ وہ بادشاہ کے محل میں ہو یا کسی مشہور اہل ذوق یا امیر کے گھر پر، صہبائی کی موجودگی اتنی ہی ضروری سمجھی جاتی تھی جتنی غالب، مومن، آزردہ، شیفتہ اور ذوق وغیرہ کی۔ دوسرے مشہور شعرا کی طرح وہ بھی طرحی زمینوں میں طبع سے آزمائی کرتے اور کامیاب رہتے تھے۔ شعر و سخن کی محفلوں میں اہل محفل سے داد حاصل کرتے اور خود ان کی داد و تحسین دوسرے شاعروں کے لئے مستحسن سمجھی جاتی تھی۔ اس دور کے شعرا یہاں تک کہ غالب بھی جو خود ستائی کی وجہ سے کسی دوسرے شاعر کو قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے، وہ بھی ان کی تعریف پر مجبور ہوجاتے اور ان کے اشعار کو دلنشین بتاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بار مرزا غالب ایک مشاعرہ کی روداد، جو ۱۷ مارچ ۱۸۴۳ء کو منعقد ہوا تھا، نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ــــ

" صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دلنشین تھے۔ آئندہ مشاعرے کے لئے " گریبانم نمی آید " طرح ہوئی ہے ..."[1]

صہبائی کی غزلیں چونکہ مختصر ہوتی تھیں ان میں سے دو تین اشعار کو دلنشین کہنا بڑی بات ہے۔

اس کے علاوہ غالب ہمیشہ ممنون، آزردہ اور صہبائی کو اپنے فارسی کلام کا مخاطب قرار دیتے تھے اور کسی دوسرے کو اس قابل نہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

۱۔ غالب، ص ۴۹۸

ایک جگہ مالک رام اپنے ایک مضمون " مرزا غالب" مین ایک شعری نشست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین ـــ

" .... تھوڑی دیر مین یکے بعد دیگرے شیفتہ ، صہبائی ، نیر رخشان ، داغ اور ظہیر بھی آگئے .... سب قادر الکلام جمع ہی تھے ـ اچھی خاصی بزم مشاعرہ ہوگئی ـ حضرت مفتی صاحب (آزردہ) نے مرزا صاحب سے فرمائش کی کہ کوئی تازہ کلام ہوتو سنائین ـ مرزا صاحب نے پہلے تو عذر کیا لیکن جب مفتی صاحب کے ساتھ صہبائی بھی اصرار کرنے لگے تو فرمایا ـ

با من کہ عاشقم ، سخن از ننگ و نام چیست
در امر خاص حجت دستور عام چیست

پوری غزل سنائی "ـ[1]

ایک اور جگہ مالک رام صدر الصدور یعنی مولانا آزردہ کے گھر ایک شعری نشست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین ـــ

" .... داغ اور ظہیر اور محمد حسین آزاد تھے ، صہبائی اپنے بعض شاگردون کے ساتھ آئے تھے ـ میر نظام الدین ممنون تھے ..."ـ[2]

مولانا امداد صابری لکھتے ہین ـــ

" دہلی کے مختلف مقامات دہلی کالج اور قلعہ معلی مین تاریخی و یادگار کثرت کے ساتھ مشاعرے ہوتے تھے چنانچہ قلعہ مین ایک مشاعرہ ہوا جس مین مولانا صہبائی اور مرزا غالب کی ہم طرح غزلین تھین "ـ[3]

۱ـ مرزا غالب ، مضمون مالک رام ، علی گڑھ میگزین ، ۴۹ـ۱۹۴۸ء ، ص ۷
۲ـ ایضاً
۳ـ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا ، ص ۲۶۱

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے ایک یادگار مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"۰۰۰۰ اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی ۔ ان کی علمیت کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بج رہا ہے ۰۰۰۰ ہزاروں شاگرد ہیں ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں ۔ فارسی کی غزل پڑھی خوب خوب تعریفیں ہوئیں ۰۰۰۰ مقطعہ پر اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ۰۰۰۰"[1]

انتظام اللہ شہابی ۲۵ فروری ۱۸۴۵ء کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" ۰۰۰۰ ۲۵ فروری ۱۸۴۵ء کو محل حیات بخش میں بادشاہ کی طرف سے مشاعرے کا انتظام ہوا جس میں خاندان بابر کے شہزادوں سے لے کر اساتذۂ دلی کو دعوت دی گئی ۰۰۰۰ چند شعرا کے پڑھنے کے بعد مولانا امام بخش صہبائی نے پہلے یہ رباعی پڑھی ۔۔

شاہا بدرت کہ اصل عز و جاہ ست

از عرش ہزار سالہ آن سو راہ ست

از چرخ نہم سوال کردم گفتند

لیکن ذرہ عتبہ بہادر شاہ ست

غزل طرحی ۔۔

چہ گل کہ در کف پا نشگفد ز خار مرا

جنون بفضل خزان میکند بہار مرا

فلک بماتم یاران رفتہ صہبائی

سر و دماغ و دل و چشم اشکبار مرا ۔[2]

۱۔ دلی کی آخری شمع ، ص ۲۱

۲۔ غدر کے چند علما ۔ ص ۱۷

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہم کو بخوبی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ صہبائی کا شمار اس وقت کے علما اور ادبا میں ہوتا تھا ۔ یہی نہیں بلکہ وہ فارسی کے مشہور شاعر بھی سمجھے جاتے تھے ۔ ہر محفل شعر و سخن میں غالب ، مومن ، شیفتہ ، آزردہ اور ممنون وغیرہ کے ساتھ صہبائی بھی شریک ہوتے ۔ نہ صرف تنہا بلکہ اکثر اپنے شاگردوں کے ساتھ آتے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان کا شمار ایک استاد شعر و سخن کی حیثیت سے کیا جانے لگا تھا ۔ غالب بھی ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کے علم و فضل کے معترف تھے اور اپنی شعر گوئی کے لئے ان کی داد سخن کو اہم جانتے تھے نہ صرف یہ بلکہ صہبائی کے کلام کو دلنشین سمجھتے تھے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں حزیں اور آرزو کے معرکہ میں صہبائی کے ایک شاگرد عبدالرحیم بیگ میرٹھی کے بارے میں اور ساتھ ہی صہبائی کے خلاف بھی چند نازیبا الفاظ کہہ جاتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں غالب اور صہبائی کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوگئے تھے ۔ ایک دوسری بڑی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ غالب کی خود ستائی اور ان کا حسن ظن ان کو کسی بھی دوسرے شاعر اور ادیب کے بارے میں اس کے علم و فضل اور شاعرانہ خوبیوں کا ، کھلے دل سے اعتراف کرنے سے باز رکھتا تھا لیکن غیر شعوری طور پر ان کے الفاظ اور ان کے برتاؤ سے یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ اس شخص کو کیا ۔۔ رتبہ دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ان کے وہ اشعار جن میں وہ اپنے عہد کے مشہور اور نامور شعرا کا ذکر عزت کے ساتھ کرتے ہیں ، ان اشعار میں صہبائی کا نام بھی شامل ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کے دل میں صہبائی کے لئے کافی عزت و احترام موجود تھا ۔

صہبائی اور بیدل ـ

مرزا عبد القادر بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء مین پٹنہ عظیم آباد مین ہوئی ـ اس وقت دہلی مین شاہجہان کی حکومت تھی ـ وہ نسلاً ترک تھے اور ارلاس کے چغتائی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے[۱]ـ

جب بیدل پانچ برس کے تھے تو ان کے والد مرزا عبد الخالق کی وفات ہوگئی ان کی پرورش اور تربیت ان کے درویش صفت چچا مرزا قلندر نے کی تھی ـ اس لئے بچپن سے ہی ان کو صوفی حضرات کی صحبت مین بیٹھنے اٹھنے کے مواقع ملے ـ ابتدا مین انھون نے شہزادہ محمد اعظم بن اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کی ـ شہزادے کی کسی بات پر ناراض ہوکر ملازمت سے دست بردار ہوگئے ـ انھین عاقل خان رازی کی سرپرستی حاصل تھی ـ انھون نے دہلی مین ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء مین وفات پائی ـ[۲] اس وقت شاہ عالم بہادر شاہ دہلی کے تخت پر متمکن ہوچکا تھا ـ

بچپن سے صوفی مشرب لوگون کی صحبت مین بیٹھنے کی وجہ سے ان کی فطرت مین فقر و استغنا اور بے ریائی پائی جاتی تھی ـ اس کے باوجود اپنے عہد کے امرا و رؤسا سے ان کے کافی اچھے مراسم بھی تھے ـ مولانا آزاد بلگرامی ان کے بارے مین لکھتے ہین ـــ

" بیدل مرزا عبد القادر عظیم آبادی ، پیر میکدۂ سخندانی و افلاطون خم نشین یونان معانی است ـ کرا قدرت کہ بہ طرز تراشیٔ او تواند رسید و کرا طاقت کہ کمان بازوے او تواند کشید ـ چنانچہ خود جرس دعوی می جنباند "ـ[۳]

۱ـ سفینۂ خوشگو ، ص ۱۰۴ ـــ ، کلیات مرزا عبد القادر بیدل ، ص ۹
۲ـ ایضاً ص ۱۲۰ ـــ ایضاً ص ۲۱
۳ـ خزانۂ عامرہ ، ص ۱۵۲

بیدل کو نظم و نثر دونون مین بہ یک وقت قدرت و مہارت حاصل تھی ۔ انھون نے تمام اصناف شعری مین طبع آزمائی کی تھی چنانچہ غزلیات ، رباعیات ، قصاید ، قطعات اور مثنویون پر مشتمل انھون نے ایک ضخیم ذخیرہ چھوڑا ہے لیکن تمام اصناف شاعری مین غزل ان کا خاص میدان ہے ۔ فلسفہ اور تصوف کی آمیزش سے انھون نے غزل کی صنف کو درجۂ کمال بخشا ہے ۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہوتے ہی شعر و سخن کا سورج بھی ڈھلنا شروع ہوید ہو گیا تھا چنانچہ اس دور کے بڑے شاعرون مین صرف دو ہی نام زیادہ اہم اور قابل ذکر ہین ۔ مرزا عبدالقادر بیدل ، اور نعمت خان عالی ۔ چنانچہ بزم تیموریہ مین اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے صباح الدین عبدالرحمن رقمطراز ہین ۔

" یا تو عالمگیری دربار کے زوال کے باعث یا شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب سے دربار مین وہ فضا قائم نہ ہوسکی ، جو اس کے (شاہ عالم بہادر شاہ) اسلاف کے زمانے مین تھی اس لئے اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری کی زمزمہ سنجی سے خالی رہا ۔ گذشتہ عہد مین ایران سے علم و ادب کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا وہ یکایک خشک ہوگیا ۔ بلند پایہ شعرا اور قابل قدر فضلا ناپید ہوگئے ۔ قابل ذکر شعرا مین صرف عبدالقادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات صالحات مین رہ گئے "۔[1]

بیدل "سبک ہندی" کے آخری بڑے نمایندہ شاعر تھے ۔ جیسا کہ قبلاً کہا گیا کہ " سبک ہندی " کی داغ بیل یون تو مغلیہ دور سے قبل پڑنا شروع ہوگئی تھی

---

۱ ۔ بزم تیموریہ ، جلد اول ص ۲۹۶

لیکن مغلیہ دور بالخصوص اکبری دور مین یہ طرز پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ۔ نظم و نثر مین دونون مین سادگی کی جگہ پرکاری ، صناعی ، خیال بافی مشکل تراکیب و استعارے ، تصنع اور آرائش لفظی نے لے لی ۔ ہندوستان مین یون تو سب ہی شعرا نے اس سبک کی پیروی کی لیکن ظہوری نے اس طرز کو بہت ترقی دی ۔ اس اسلوب کی ظاہری شان و شوکت اور تابناکی نے اہل قلم حضرات کو کچھ اتنا گرویدہ اور متاثر کیا کہ عہد اکبری کے بعد بھی اس کی مقبولیت مین کوئی کمی واقع نہ ہوئی ۔ اور یہ مصنوع طرز تحریر بعد کے ادوار مین بھی بدستور جاری رہا ۔ یہان تک کہ بیدل جیسے باکمال اہل قلم نے اس کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ۔ انھون نے نظم و نثر دونون مین یکسان طور پر اس اسلوب کو برتا ۔

فارسی ادب مین بیدل کی شاعری نے ادب کو ایک نیا موڑ دیا ۔ اس سے قبل بلکہ ابتدائے شعر و ادب سے ہی شاعری بالخصوص صنف غزل کو جذبات انسانی کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن بیدل نے اس کو فکر کی گہرائی اور معانی کی گیرائی بخشی ۔ ان سے قبل شعرا کی توجہ بیشتر طرز ادا کی جدت اور لفظی صنائع و بدایع پر رہتی تھی لیکن بیدل نے شاعری مین جذبات کے ساتھ فلسفے اور تصوف کی آمیزش کرکے اس کو معنوی بلندی عطا کی ۔ ان کی شاعری محض ذہن و دل کو سکون و طمانیت کا احساس ہی عطا نہین کرتی بلکہ قاری کو اس کی گہرائی تک سوچنے پر مجبور کردیتی ہے ۔ انھون نے غزل کو تصوف ، عرفان اور فلسفیانہ افکار کا حسین امتزاج بخشا ۔ بیدل کے یہان غزل مین معنی آفرینی کی فراوانی ملتی ہے جس کے اظہار کے لئے انھون نے نئے الفاظ و تراکیب بھی وضع کین جس سے ان کی

غزل کو لفظی و معنوی دونون اعتبار سے وسعت ملی ۔

چونکہ وہ اسرار کائنات کے رموز سے آگاہ ہونا چاہتے تھے اس لئے ان کا ذہن تفکر کے مرحلون سے گزر کر ادراک کی منزل کی جستجو کے لئے بیقرار رہتا ہے ۔ ان کے تفکر اور تخیل کی گلکاریان ان کے اشعار سے عیان ہین ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے تعمق فکر کی آئینہ دار ہے ۔ بیدل نے شاعری مین جذبات کے ساتھ فلسفہ اور تصوف کے اسرار و رموز کا اظہار اپنی شاعری مین کیا ۔ کائنات کی حقیقت ، انسانی فطرت کے اسرار و رموز اور آفاقی حقائق کی تلاش ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہین جس سے ان کے کلام مین رمزیت اور معنویت پیدا ہوگئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو سمجھنا ایک عام فہم قاری کے لئے آسان نہین ۔ ان کے کلام مین دور از کار تشبیہین ، نئی نئی تراکیب اور بلیغ استعارات کا استعمال بھی بکثرت ملتا ہے ۔

ان مندرجہ بالا خصوصیات کی بنیاد پر ان کا اسلوب نگارش یا طرز بیان جو " سبک ہندی " کے نام سے جانا جاتا ہے زمانۂ مابعد مین " طرز بیدل " کے نام سے بھی مشہور ہوا ۔

بنیادی طور پر بیدل شاعر تھے لیکن نثر مین بھی ان کی تصانیف ملتی ہین ۔ ان مین بھی نثر کے درمیان وہ اشعار کی پیوند کاری کرتے چلے جاتے ہین ۔ ان کی نثری تصانیف مین " چہار عنصر " اور " نکات بیدل " ہین اس کے علاوہ ان کے مکاتیب بھی جو ادبی حیثیت رکھتے ہین ، "رقعات بیدل" کے نام سے مشہور ہین ۔

مرزا عبدالقادر بیدل کی وفات اور صہبائی کے دور مین مشکل سے ایک سو سال کا وقفہ تھا اس لئے صہبائی کی شاعری پر طرز بیدل کا اثر پڑنا کوئی تعجب کی بات نہین ۔ چونکہ اس وقت تک بیدل کی طرز تازہ ترین طرز سمجھی

جاتی تھی اس لئے اس دور میں بیدل کی روش فکر و شاعری کی تقلید کی روایت عام تھی دور عالمگیری یعنی بیدل کی وفات کو سو سال گزر جانے کے باوجود بیدل کی مخصوص طرز فکر جو نظم و نثر میں یکساں طور پر پائی جاتی تھی ، اس کا اثر و نفوذ غالب اور صہبائی کے دور تک باقی اور برقرار تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جیسے شخص جن کی انفرادیت مسلم تھی اور جو بعد میں طرز و روش بیدل سے منحرف ہوگئے تھے ، اپنی شاعری کی ابتدا میں بیدل کے اثرات سے اپنے کو الگ نہ رکھ سکے اور اس اعتراف پر مجبور تھے ۔

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ماہیچ

یا

اسد ہرجا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

چونکہ صہبائی کا شمار بھی اپنے زمانے کے علما و فضلا میں ہوتا تھا اور صہبائی کو اپنی مشق فکر و طبع کے لئے فارسی کا میدان ہی پسند آیا تھا جیسا کہ ان کی علمی تصانیف اور آثار سے ظاہر ہے ، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس روایت سے منکر ہوجاتے اور بیدل کی تقلید کو اپنی نظم و نثر میں نہ اپناتے ۔

چنانچہ حالی لکھتے ہیں ــــ "

" صہبائی اور علوی مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے "۔[1]

چونکہ صہبائی مولوی عبداللہ خان علوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مولوی عبداللہ خان علوی بیدل کے مقلد تھے اس لئے صہبائی کے کلام میں بیدل کا رنگ پایا جانا ناگزیر تھا ۔ ایک اور جگہ حالی لکھتے ہیں ــــ

---

۱ ۔ یادگار غالبؔ ، ص ۲۳

" دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شایع ہوئی اور علوی اور صہبائی پر آکر ختم ہوگئی ۔ "[1]

حالی کے اس قول میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مرزا بیدل کی طرز (اگرچہ اس کا آغاز بہت پہلے ہوچکا تھا) کے آخری بڑے شاعر صہبائی تھے ۔ ان کے بعد یہ طرز ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ فارسی زبان ہی کافی حد تک گوشۂ گمنامی میں چلی گئی ۔ ان کے بعد فارسی شاعری میں صرف ایک بڑا نام نظر آتا ہے اور وہ نام ہے اقبال کا ۔ اقبال نے طرز بیدل سے آزاد ہوکر اپنے فکر و فلسفہ کے اظہار کے لئے فارسی کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا تھا ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے انہوں نے ایک نئی راہ اختیار کی ۔ اور وہ قدیم روایات سے ہٹ کر فارسی شاعری میں اپنا ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب بھی ہوگئے ۔

جیسا کہ کہا گیا کہ صہبائی کے دور میں بیدل کی طرز جدید طرز خیال کی جاتی تھی اس لئے صہبائی آخر وقت تک طرز بیدل کے مقلد رہے اور اپنی نظم و نثر فارسی میں بیدل کی روش کو اپنائے رکھا ۔ اگر ذوق بھی ان کی فارسی دانی کے مطابق بلند ہوتا تو وہ فارسی کے اپنے دور کے سب سے اچھے شاعر مانے جاتے لیکن غالب کے برعکس وہ اپنی فکر کو بیدل کی طرز سے آزاد نہ کرسکے ۔ نہ ہی ان کی وسعت نظر احاطۂ بیدل سے باہر نکل سکی ۔ جہاں تک فارسی زبان اور اس کے علم کا تعلق ہے اس کا اندازہ ہم کو دہلی کالج میں ان کی ملازمت کے سلسلے میں آزردہ کے بیان سے ہوجاتا ہے ۔ مومن اور غالب کے بعد وہ صہبائی کو ایک ماہر فارسی دان سمجھتے تھے ۔ اگرچہ خود صہبائی ازراہ انکساری اپنے مقابلے میں آزردہ کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں ـــــ

---

۱ ـ یادگار غالب ، ص ۵۸۳

چه می بری بر آزرده شعر صهبائی

که گر که ست بمیزا بیش کم ز پاسنگ است

اگرچه ان کا علم و فضل ایسا تھا که وہ غالب کی طرح اپنے سوا کسی کو قابل اعتنا نه سمجھین لیکن ان کی سرشت مین خود بینی اور خود ستائی کا شائبه تک نه تھا ۔ اس کے برعکس وہ انتہائی منکسرالمزاج تھے اور اپنے متعلق کسی خوش فہمی کو دل مین جگه نه دیتے تھے ۔ ان کی سیرت کے اس پہلو کا اظہار ان کی شاعری مین بھی ہر جگه کارفرما نظر آتا ہے ۔

اگرچه یه صحیح ہے که صہبائی کی شاعری مین دور متاخرین کے فارسی شعرا بالخصوص بیدل کا رنگ جھلکتا ہے کیونکه ان کی شاعری ان کی فاضلانه علمیت ، تہه دار مضامین اور فنی لوازمات شاعری سے پر ہونے کی وجه سے ناقابل فہم اور ادق نظر آتی ہے ۔ ان کے بیشتر اشعار ان خصوصیات کے زیر اثر جوش اور تاثیر سے خالی ہین لیکن اگر بنظر غائر ان کے اشعار کا مطالعه کیا جائے تو ہم کو ان کے اشعار مین نزاکت فکر ، فلسفیانه گہرائی اور معنویت بھی نظر آتی ہے ۔ تقلید بیدل اور اس کے اثرات کی صریح موجودگی کے باوجود صہبائی کی اپنی انفرادیت تسلسل کے ساتھ برقرار نظر آتی ہے ۔ چنانچه ان کے کلام مین اکثر ایسے اشعار بھی ملتے ہین جو نسبتاً سادہ آسان فہم اور دلنشین ہین جیسے ۔۔

صہبائیا بوسعت رحمت نگاه کن

یکسو بنه شمار گناه ثواب را

مپسند غره بر رخ خود ماهتاب را

یکشب بیا ز چهره بر افگن نقاب را

دوش رحمی در ضمیر آن بت کافر گزشت

با رقیبی گفت کو صہبائی غمناک ما

جیسا کہ قبلاً کہا گیا "سبک ہندی" کی داغ بیل یون تو فغانی نے ڈالدی تھی ظہوری نے اس کو ترقی دی اور بیدل نے اس کو منتہائے عروج پر پہنچا دیا ۔ ان کے بعد اپنے ابتدائے دور شاعری مین غالب نے بھی بیدل کی پیروی کی لیکن بعد مین وہ اس طرز فکر سے اجتناب برتنے لگے تھے ۔ صہبائی کا شمار بھی متاخرین فارسی شعرا کے آخری بڑے شاعرون مین ہوتا تھا کیونکہ اس دور مین صہبائی تنہا ایسے شاعر تھے جنھون نے صرف فارسی زبان مین ہی مشق سخن کی اور اردو زبان کی مقبولیت کے باوجود وہ اس سے گریز برتتے رہے اس لئے اگر ہم یہ کہین کہ فارسی زبان مین " سبک ہندی " کی شروعات ظہوری سے ہوئی ، بیدل نے اس کو بام عروج پر پہنچایا اور صہبائی پر اس کا اختتام ہوا تو یہ بات غالباً غلط نہ ہوگی ۔

یون متاخرین مین جن نے بھی فارسی زبان مین شعر کہے وہ سب ہی " سبک ہندی " کے زمرے مین آجاتے ہین لیکن ان تینون شعرا کے نامون کو اس لئے خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ شعرا تھے جن کی شاعری مین ہم کو " سبک ہندی " کی خصوصیات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہین ۔ بالفاظ دیگر یہ وہ شعرا تھے جنھون نے " سبک ہندی " کی نمایندگی دل و جان سے کی تھی ۔

صہبائی آہنگ بیدل کی تعمق فکر اور ندرت خیال سے متاثر تھے ۔ انھین بیدل کے کلام سے ایک طرح کا جذباتی لگاؤ تھا اس لئے انھون نے اپنی شاعری مین بھی بیدل کے اسلوب سخن کو اپنانے کی کوشش کی ۔ کہین کہین وہ کامیاب بھی ہوئے ہین ۔ لیکن اپنی اس جد و جہد مین زیادہ کامیابی انھین اس لئے نہ مل سکی کہ بیدل شعر کہنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے ۔ اس کے برخلاف جیسا کہ قبلاً کہا گیا صہبائی اپنے فطری ذوق اور وجدان سے مجبور ہوکر شعر نہ کہتے تھے بلکہ اس وقت کے

ادبی ماحول کو دیکھتے ہوئے ضرورتاً یا روایتاً یا پھر شوقیہ شعر کہا کرتے تھے۔ اپنے علم و فضل کی فراوانی اور طبع موزون کے سبب وہ شعر تو بآسانی کہہ لیتے تھے لیکن کلام میں قدرتی طور پر وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو ایک اچھے شاعر کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیدل کے کلام میں جو فلسفہ کی باریکیاں اور تصوف کی چاشنی ہے وہ صہبائی کے وہاں اس سطح پر نہیں۔ بیدل کو بچپن سے صوفیاء کرام اور اہل دل حضرات کی صحبت نصیب ہوئی تھی جس کا اثر ان کی شخصیت اور کلام پر پڑنا لازمی چیز تھی۔

صہبائی کے کلام میں اکثر وہ خیالات ملتے ہیں جو بیدل کی شاعری میں زیادہ تر پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ بیدل کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ مثال کے طور پر بیدل کے کہتے ہیں۔

صورت وہم ہستی متہم داریم ما
چون حباب آئینہ برطاق عدم داریم ما [1]

خواہی نفس خیال کشد، خواہ کرد وہم
چیزے نمودہ ایم در آئینۂ حباب [2]

مندرجہ بالا اشعار میں وہ ناپائیداری حیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی ایک حباب کی زندگی سے زیادہ لمبی اور پائیدار نہیں۔ انسان کی زندگی اس عالم کائنات میں محض عارضی وجود رکھتی ہے اور اس کی مثال ایک حباب کی سی ہے۔ جس طرح کہ ایک حباب پل بھر کے لئے پانی کی سطح پر ابھرتا ہے اور غائب ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح انسان کی ہستی بھی دنیا سے پل بھر میں معدوم ہوجائے گی۔ اسی

۱۔ دیوان بیدل، مع نکات، ص ۹
۲۔ ایضاً ص ۵۶

خیال کو صہبائی نے مندرجہ ذیل اشعار مین یون ادا کیا ہے۔

چون شرر حاصل ما در گرو دست فناست

برق باریشه کند سر بدر از دانهٔ ما

محو نگار خانهٔ نیرنگ می کند

طرز فنا و هستی عالم حباب را [1]

تصوف کے موضوع پر بیدل کا شعر ہے۔

دل من گرم آتش خانه کیست

نگاه حیرتم پروانه کیست [2]

اسی موضوع پر صہبائی کہتے ہین۔

حیرت دل پرده پوش روی کیست

جلوها شد رونما کائینه را [4]

یا

هزار جلوه درین پرده ندانستم

تو در کناری و شد جان در انتظار مرا [5]

اپنی تمامتر مشکل پسندی کے باوجود بیدل کے کلام مین بھی کچھ سادہ مگر گہرے مطالب رکھنے والے اشعار ملتے ہین مثلاً

حرص مانع نیست بیدل ورنه اسباب معاش

انچه ما در کار داریم اکثرے درکار نیست [6]

۱۔ کلیات صہبائی، جلد اول ص ۲۳۷۔
۲۔ ایضاً ص ۲۳۸
۳۔ دیوان بیدل، مع نکات۔ ص ۱۰۰
۴۔ کلیات صہبائی۔ ص ۲۴۲
۵۔ ایضاً ص ۲۴۹
۶۔ دیوان بیدل مع نکات، ص ۱۰۰

مندرجہ بالا شعر مین فقر و استغنا کی ترغیب ملتی ہے۔ یہ شعر تصوف کی منزلون مین سے ایک منزل کا پتہ دیتا ہے۔ تصوف یعنی تلاش حق مین عارف کو ایک ایسی منزل سے بھی گزرنا پڑتا ہے جب وہ دنیا اور اس کے علایق سے رشتہ توڑ کر صرف حقیقت کی جستجو اور تلاش کو ہی اپنا مقصد بنالیتا ہے۔ اسرار کائنات جاننے یا حقیقت کا راز جاننے کے لئے اس منزل سے گزرنا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ دنیاوی علایق سے کنارہ کش نہین ہوگا تو کبھی اپنے مقصود تک نہین پہنچ سکتا۔ انسان جو اس دنیا مین عارضی زندگی گزارنے کے لئے آتا ہے، دنیا مین آکر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ یہین رہنا ہے۔ اور اس کے لئے وہ سامان عیش و آسائش اکٹھا کرنے مین مصروف ہوجاتا ہے اور ایک کے بعد دوسری چیز کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ جبکہ اگر وہ بغور دیکھے تو ان اسباب عیش و آرام مین سے اکثر چیزون کی اسے بالکل ضرورت نہین ہوتی۔

جیسا کہ قبلاً بتایا جاچکا ہے کہ صہبائی کے کلام مین بھی سادہ اور دلنشین اشعار کی کمی نہین ان کے سادہ عام فہم اور دلنشین اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاچکے ہین اس لئے یہان پر ان کی ضرورت نہین۔

آخر مین یہ کہنا کافی ہوگا کہ بطور مجموعی صہبائی کے کلام مین بیدل کی تقلید اور خیال و زبان مین ان کے کلام سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس کا اندازہ دونون کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

باب سوم

صہبائی کی نثری خدمات ـــــ تنقید اور تجزیہ

۱ـ ہندوستان کے دورۂ متاخرین میں سبک ہندی کی روایت

۲ـ نثر نگاری میں صہبائی کا اسلوب نگارش

۳ـ ہندوستان کے روایتی طرز نگارش میں
صہبائی کی نمایندگی خصوصی حوالوں کے ساتھ

صہبائی کی نثری خدمات ـــــ تنقید و تجزیہ

صہبائی ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلی پایہ کے مصنف، انشا پرداز اور شارح بھی تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ انشا پرداز، محقق اور شارح پہلے تھے اور شاعر بعد میں تو کچھ بیجا نہ ہوگا ـ کیونکہ صہبائی کے علمی و ادبی آثار بیشتر فارسی نثر میں ہی پائے جاتے ہیں ـ ایک مطالعے سے ان کی عالمانہ بصیرت، ان کی زبان دانی اور ان کے علم و فضل اور سخن طرازی کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے ـ

صہبائی کی نثری نگارشات چند علمی کتابوں اور رسالوں پر مشتمل ہیں ـ ان کتابوں یا رسالوں کے موضوعات زیادہ تر تحقیق لغات، عروض و قافیہ، دستور زبان فارسی، مصطلحات، محاورات اور ضرب الامثال، معمیات اور علم شعر و فن بدیع سے متعلق ہیں ـ صہبائی کو فن معما میں کافی قدرت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ معمائی بھی کہلاتے تھے ـ اس کے علاوہ انھوں نے مطالعے بھی لکھے ہیں اور دیباچے اور خاتمے بھی ـ ان کی تقاریظ اور مکاتیب ان کی انشا پردازی کی بین مثالیں ہیں ـ

ان کی نثری نگارشات کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کی طرز نگارش اور اس کی خصوصیات کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے ـ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی طرز نگارش دور متاخرین کے اسلوب نگارش کی نمایندگی کرتی ہے ـ دور متاخرین کا اسلوب نگارش دراصل "سبک ہندی" کے ذیل میں آتا ہے ـ "سبک ہندی" اور اس کی خصوصیات کو سمجھنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے مختصراً دور بہ دور نثر نگاری کا ارتقاء بالخصوص دور متاخرین کا اسلوب

تیسرا اسلوب قدیم زمانہ مین رائج تھا لیکن اس وقت بھی اس کا استعمال بہت کم لوگون نے کیا تھا ۔

فارسی ادب کی تاریخ کا اگر آغاز سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابتدائی دور کا فارسی ادب، مضمون اور عبارت دونون اعتبار سے سادہ، آسان اور عام فہم تھا ۔ انسان جو کچھ محسوس کرتا تھا سلیس اور آسان زبان مین اس کا اظہار کر دیتا تھا ۔ یہی وہ دور تھا جسے ہم دورۂ متقدمین کے نام سے جانتے ہین ۔ اس دور مین سادگیٔ خیال اور سادگیٔ بیان ہی ادب، خواہ وہ نثر ہو یا نظم، کی خصوصیات مانی جاتی تھین ۔ چنانچہ دسوین اور پانچوین صدی ہجری (دسوین اور گیارہوین صدی عیسوی) مین جو نثری آثار وجود مین آئے ان کی زبان نہایت سادہ، صریح اور بامحاورہ تھی ۔

چھٹی اور ساتوین ہجری مین موضوعات کے اعتبار سے فارسی نثر مین وسعت پیدا ہوئی ۔ متنوع مضامین اور مختلف مسائل پر تالیفات لکھی گئین جیسے تاریخ، سیاست، حکمت، طب، نجوم، فقہہ، طبعیات اور ریاضیات وغیرہ ۔ قدرتی طور پر مختلف مضامین اور خیالات کی ادائیگی کے لئے نئے نئے الفاظ اور تراکیب کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ زبان مین وسعت اور پختگی آئی اور نثر نگاری کے اسلوب مین تبدیلی آنا شروع ہوئی ۔ زبان مین عربی الفاظ اور تراکیب کے داخل ہوجانے کی وجہ سے بھی زبان نسبتاً مشکل اور پر تکلف ہوگئی ۔ تکلف اور تصنع کے ساتھ نثر نگاری مین ایک نئے اسلوب کا آغاز ہوا جو مصنوعی اور پر تکلف نثر کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

چھٹی اور ساتوین صدی کے اوائل کی نثری تصنیفات، نہ صرف تعداد اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اہم ہین بلکہ اسلوب نثر نگاری کے اعتبار سے بھی اہم اور قابل

توجہ ہین ۔ کیونکہ یہی وہ دور تھا جب نثر مرسل مین پختگی آئی اور وہ اپنے درجۂ کمال کو پہنچی اور اسی زمانے سے نثر نگاری مین تصنع کا آغاز ہوا ۔ کیونکہ اس وقت تک انسانی ذہن ارتقاء کی کافی منزلین طے کرچکا تھا اس لئے وقت کی ضرورت کے مطابق مضامین مین وسعت اور تنوع اور اس کے اظہار کے لئے نئے نئے الفاظ اور نئی تراکیب کا استعمال بھی لازم تھا چنانچہ دور ابتدائی کی فارسی نثر کی سادگی اور بے تکلفی کی جگہ اب تکلف ، طول کلام ، صنائع و بدایع کا کثرت سے استعمال خیالات مین پیچیدگی جیسی خصوصیات نے لے لی تھی ۔ یہ اسلوب نگارش کسی ایک موضوع کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ ہر قسم کے موضوعات ، اخلاقیات ، قصص و حکایات مکاتیب ، تصوف و حکمت یہان تک کہ تواریخ بھی مصنوعی اور پرتکلف نثر مین لکھی جانے لگین ۔ اگرچہ تاریخی کتابون کا بنیادی مقصد تاریخی حقائق و مطالب کو بیان کرنا ہوتا ہے جس کے لئے مصنوعی اور پرتکلف طرز تحریر کی بالکل ضرورت نہین ہوتی لیکن چونکہ اس وقت تک مرسل نثر کے ساتھ ابتدا اور اسلوب نگارش وجود مین آچکا تھا لہذا "نثر فنی" کے دلدادہ حضرات اپنے سادہ مطالب کو بھی عبارت آرائی کے جامہ مین پیش کرنے لگے ۔ سجع ، ترصیع اور صنائع لفظی سے آراستہ ان کی نثر ایک نئے اسلوب کے وجود مین آنے کا سبب بنی ۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دورۂ متوسطین جس مین ایک طرف اگر مرصع ، مزین اور بلند آہنگ اسلوب کی تحریرین ملتی ہین تو دوسری طرف سادہ ، بے میل اور عبارت آرائی سے معرا تصنیفات بھی نظر آتی ہین یعنی دورۂ متوسطین مین دونون قسم کی طرز نگارش ایک دوسرے کے متوازی چلتی نظر آتی ہین ۔

جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری سے ہی عام اور سادہ نثر کے ساتھ بلیغ ، مرصع اور تصنع آمیز نثر کی داغ بیل پڑ چکی تھی ۔ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت تک مجموعی طور پر فارسی نثر میں پختگی آچکی تھی اور بتدریج وہ ترقی کر رہی تھی ۔ اس کا ثبوت وہ تصانیف ہیں جن میں متوازی طور پر دونوں اسالیب اختیار کئے گئے ہیں ۔ اگر ایک طرف شگفتہ فصیح اور سادہ نثر میں لکھی گئی " چہار مقالہ " " کلیلہ و دمنہ " اور " گلستان سعدی " جیسی تصانیف کا وجود ملتا ہے تو دوسری طرف " مقامات حمیدی " ، " ذخیرہ خوارزم شاہی " اور " تاریخ وصاف " جیسی مرصع بلیغ طرز تحریر کی حامل کتابیں بھی ہم کو نظر آتی ہیں ۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری (بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی) کے بعد تو یہ طرز یعنی مشکل نویسی اور مرصع طرز انشاء کی روش عام ہوتی گئی اور سادہ و روان اسلوب کے ساتھ مزین اور آراستہ طرز تحریر پر مشتمل سرمایۂ کتب خاصہ ضخیم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری (چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی) میں یعنی دورۂ تیموری میں انوار سہیلی ، اخلاق جلالی اور روضۃ الصفا جیسی کتابیں وجود میں آئیں ۔ اس کے برعکس اس دور میں بھی سادہ نویسی کی چند عمدہ مثالیں ملتی ہیں جیسے " بہارستان جامی " یا تاریخ پر چند تصانیف جیسے حافظ ابرو کی " زبدۃ التواریخ " یا فصیحی خوافی کی " مجمل " وغیرہ ۔ ان شواہد کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور متوسطین میں سادہ ، فصیح اور مصنوعی یا فنی طرز نگارش دونوں ہی دوش بدوش چل رہی تھیں اور اس کے بعد تدریجاً مشکل نویسی کا رواج عام ہوتا چلا گیا ۔

امرا اور شاہان وقت کے لئے اور ان کے نام معنون کرنے کی جو روایت اس دور میں تھی وہ بھی اس طرز تحریر کی ترقی کا سبب بنی ۔ کیونکہ ہر مصنف بادشاہ وقت کے سامنے اپنی علمی فضیلت ، صلاحیت اور فن انشا پردازی کا اچھا نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا ۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ایران کی تاریخ میں ایک زبردست حادثہ رونما ہوا یعنی منگول حملے نے ایران کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں جس کے نتیجے میں فارسی زبان و ادب کے چمن میں پہلی جیسی تازگی اور رونق نہ رہی تاہم مغلوں کی لوٹ مار اور غارت گری کے باوجود کچھ مدت کے بعد نہ صرف علم و ادب کے ماحول میں پھر سے جان آگئی بلکہ علوم کے بعض شعبے بالخصوص تاریخ نویسی کو جو ترقی ہوئی اس کے لئے منگول دور خاص امتیاز کا حامل ہے ۔ اس دور کے صاحب علم و فضل میں نصیر الدین طوسی، عطا ملک جوینی ، رشید الدین فضل اللہ اور سعدی شیرازی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ لیکن اس کے بعد فارسی ادب کے میدان میں کسی قابل ذکر نثر نگار کا نام ہم کو نظر نہیں آتا علاوہ ملا نورالدین جامی کے ۔ جامی ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ کثیرالتصانیف نثر نگار بھی تھے ۔ انھوں نے "گلستان" کی طرز پر "بہارستان" بھی تحریر کی تھی ۔ اس کے علاوہ انھوں نے تصوف پر کئی کتابیں اور رسالے لکھے ۔

ایران میں تیموری دور کے بعد دور صفویہ کا آغاز ہوا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغل بادشاہ حکمرانی کر رہے تھے ۔ اور ان کے زیر سایہ فارسی شعر و ادب خوب پھل پھول رہا تھا ۔ اگرچہ امن و امان کے اعتبار سے اور دیگر علوم و فنون کی ترقی کو دیکھتے ہوئے صفوی دور عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے لیکن علم و ادب کے اعتبار سے اس کی اہمیت اتنی نہیں جتنی کہ ایران میں دوسرے ادوار کو

خاص رہی تھی ۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں یہی دور فارسی شعر و ادب کے اعتبار سے انتہائی اہم اور ایرانی شعر و ادب سے ممتاز ثابت ہوا ۔ کیونکہ تمید اسی زمانے میں ہندوستان میں مغل شہنشاہ شعرا و ادبا پر انعام و اکرام کی وہ بارش کررہے تھے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی ۔ صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے امرا و اراکین سلطنت بھی اہل علم و ادب کی قدر شناسی اور داد و دہش میں بادشاہوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کررہے تھے ۔ چنانچہ صفوی دور کے بیشتر شاعر و ادیب مغل شہنشاہوں اور امرا کی نوازش و کرم سے فیض یاب ہونے ایران سے ہندوستان چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی ۔ اس عہد میں کچھ شاعر و ادیب ایسے بھی تھے جنھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر شعر و ادب کے ماحول میں ہی آنکھ کھولی ۔ بہرحال دور تیموریہ میں دور متاخرین کی خصوصیات کے تحت جو سرمایہ علم و ادب وجود میں آیا وہ " سبک ہندی " کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

ہندوستان کے دورۂ متاخرین میں سبک ہندی کی روایت ۔

سبک ہندی سے مراد وہ اسلوب نگارش ہے جس کے تحت نثر و نظم میں تصنع ، مبالغہ ، صنائع بدایع ، دقیق مضامین و مطالب اور تراکیب نو کا کثرت سے استعمال ، جیسی خصوصیات شامل ہوگئیں ۔ سبک ہندی کے سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ سب صرف ہندوستان میں ہی رائج تھا بلکہ ایران میں بھی اس دور میں جتنے شاعر و ادیب گزرے ہیں وہ بھی اس طرز نگارش کی پیروی کرتے تھے ۔ جیسا کہ گذشتہ ادوار میں دیکھا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں بھی کوئی مخصوص جگہ شعر و ادب کا مرکز قرار پائی اور مجموعی طور پر اس کی ایک جیسی خصوصیات پائی گئیں تو شعر و ادب کے اس مخصوص طرز کو اس جگہ کا نام دیدیا گیا جیسے سبک خراسانی یا سبک عراقی وغیرہ ۔

چونکہ تیموری دور میں فارسی علم و ادب کا مرکز ایران سے ہندوستان منتقل ہو گیا تھا اور شعر و نثر نگاری اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی یعنی مبالغہ، نئی نئی تراکیب اور تشبیہات، صنائع لفظی و معنوی جیسی خصوصیات کا استعمال ترقی کی معراج اور خوبیٔ تحریر سمجھا جانے لگا تھا اور چونکہ اس عہد میں ہندوستان شعر و ادب کا مرکز ہو گیا تھا اس لئے اس دور کی شاعری اور نثر نگاری کو "سبک ہندی" کا نام دیدیا گیا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایران میں "سبک ہندی" کی طرز نگارش کا رواج نہیں تھا بلکہ اس عہد میں ہندوستان کے ساتھ ایران کے شعرا اور نثر نگار بھی سبک ہندی کے طرز کی پیروی کرتے تھے مثلاً ظاہر وحید قزوینی کو ایران کے سبک ہندی کا مشہور نثر نگار کہا جا سکتا ہے ۔ ان کی کتاب "انشائے ظاہر وحید" کو "سبک ہندی" کی نمایندہ نثر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ یہ کتاب ان خطوط پر مشتمل ہے جو اس نے وزیر کی حیثیت سے شاہ ایران کی طرف سے دوسرے سلاطین اور امرا کو لکھے تھے ۔ موجودہ دور کے ایرانی نقاد تو یہ تک کہتے ہیں کہ تیموری دور کے آخری بڑے شاعر اور نثر نگار جامی کی تحریر میں کسی حد تک یہ خصوصیات پائی جاتی تھیں جو آگے چل کر "سبک ہندی" کی شکل میں ظاہر ہوئیں[1] ۔

ہندوستان میں فارسی ادب کا آغاز محمود غزنوی کے حملے سے ہوا ۔ غوری سلاطین کے عہد میں اور اس کے بعد دوسرے ادوار میں فارسی زبان و ادب کا شوق اور ادبی سرگرمیاں بڑھیں اور اس کے بعد یعنی دور مغلیہ میں تو فارسی شعر و ادب کا ذوق و شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایران کی ادبی سرگرمیاں ہندوستان کی ادبی سرگرمیوں کے مقابلے میں ماند پڑ گئیں ۔ ان ادوار میں بادشاہوں کی درباری زبان بھی فارسی ہی تھی ۔

---

۱ ۔ سبک شناسی جلد سوم ص ۲۲۷ ، ملک الشعرا بہار

ہند وستان مین فارسی نثر کی تاریخ کم و بیش اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ فارسی شاعری کی ۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہند وستان مین فارسی شاعری اور نثر نگاری دونون نے بیک وقت ترقی کی منزلین طے کین ۔ ہند وستان کی پہلی اہم نثری تصنیف شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوری (م ۱۰۷۱ء) کی مشہور و معروف کتاب " کشف المحجوب" ہے جو تصوف کے موضوع پر پہلی کتاب تصور کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد فخر مدبر کی تصنیف "شجرہ انساب" ، سدید الدین محمد عوفی کی مشہور کتاب "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" وغیرہ ہین ۔

دراصل ہند وستان مین عہد متوسطین کی بیشتر نثری تخلیقات کا مجموعی اسلوب اور طرز نگارش سادہ نگاری کے ذیل مین آتا ہے ۔ اس عہد یعنی گیارہوین ، بارہوین اور اوائل تیرہوین صدی عیسوی مین ہند وستان مین روان اور سادہ طرز نگارش والی تالیفات کے ساتھ مرصع اور ثقیل انداز تحریر کی کتابین بھی وجود مین آنے لگی تھین جیسے حسن نظامی نیشاپوری کی "تاج المآثر" ۔ اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو نے بھی ترصیع ، عبارت آرائی ، نثر مصنوع اور عالمانہ طرز تحریر کی کچھ تصانیف پیش کین جیسے خزائن الفتوح اور اعجاز خسروی ۔ ان کے بعد چودھوین صدی مین عین الدین الملقب بہ عین الملک بن ملہرو نے انشاء مراسلات اور مکاتیب کے ذریعے فارسی نثر نگاری کے میدان مین بالعموم اور فن انشاء مین بالخصوص ایک نئے باب کا آغاز کیا ۔ عین الملک ملہرو نہ صرف اپنے عہد کی ممتاز اور اہم شخصیت تھے بلکہ صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے ۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ عین الملک سے قبل حضرت امیر خسرو مرصع و مسجع طرز تحریر کی طرح ڈال چکے تھے مختصر یہ کہ قرون وسطی کے ہند وستان یعنی چودھوی صدی عیسوی مین

فارسی نثر کے سبک اور اسٹائل سے متعین اور بر ابل موڑ لے لیا تھا چنانچہ اگر ایک طرف سادہ انشاء نگاری کا رواج تھا جس کی عمدہ مثالیں تاریخ فیروز شاہی برنی ، فوائد الفوائد اور سیر الاولیا جیسی تصانیف ہیں تو دوسری جانب مرصع ، مزین اور مصنوع نثر کے نمونے بھی ہندوستانی نثر کے دامن کو کشادہ تر اور فارسی ادب کے دامن کو وسیع تر کر رہے تھے ۔ مرصع نثر نگاری کے ضمن میں بہمنی خاندان کے عالم اور دانشور وزیر محمود گاوان کا نام قابل ذکر ہے جس کے منشآت کے دو مجموعے یعنی "ریاض الانشاء" اور "مناظر الانشاء" اس طرز انشاء کے نمایندہ کہے جا سکتے ہیں ۔

محمود گاوان بہمنی خاندان کا ذی علم اور ذی فہم وزیر اعلیٰ تھا اور اپنے عہد کا ممتاز ترین فارسی انشا پرداز سمجھا جاتا تھا ۔ اس کو ایران کے مشہور شاعر مولانا نورالدین جامی سے قریبی ربط تھا اور ان سے خط و کتابت بھی رکھتا تھا ۔ اس کے علاوہ ایران کے دیگر مشاہیر اہل علم سے بھی اس کی خط و کتابت تھی ۔ میرے ناچیز رائے میں یہی وہ وقت تھا جب ایران میں جامی اور ہندوستان میں محمود گاوان کے ہاتھوں "سبک ہندی" کی بنیاد پڑ رہی تھی ۔ خط و کتابت کے ذریعے ایک دوسرے کی طرز انشاء کا اثر قبول کرنا بالکل قدرتی امر ہے ۔ جس کا اعتراف ایران کے ادیب ملک الشعراء بہار نے بھی کیا ہے جس کا ذکر اس سے قبل ہم کر چکے ہیں ۔

تاریخی کے اعتبار سے فارسی زبان و ادب میں دور متاخرین کا آغاز کم و بیش سولھویں صدی عیسوی یعنی دور تیموری کی تاسیس سے ہوتا ہے جب تیموری خاندان کے وارث ظہیرالدین محمد بابر نے ہندوستان میں اس حکومت کی بنیاد ڈالی جس کو ہندوستان میں دور مغلیہ کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

دور مغلیہ میں شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی نثر کو بھی بہت ترقی ہوئی اور مختلف موضوعات پر بیشمار کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں یا ترجمہ کی گئیں۔ اگرچہ اس دور میں فارسی شاعری اور فارسی نثر میں "سبک ہندی" کی خصوصیات یعنی اغلاق و اشکال اور پیچیدگیٔ خیال و عبارت آرائی کا رواج عام ہوگیا تھا تاہم اس دور میں بھی کچھ کتابیں ایسی لکھی گئیں جو سادہ نویسی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مثلاً "گلبدن بیگم کی "ہمایون نامہ" اور ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور تالیف "منتخب التواریخ" وغیرہ۔

اس امر میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ دور مغلیہ بالخصوص اکبری عہد ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کے شباب کا زمانہ تھا۔ اکبر کے دور کی روایات جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں بھی برقرار رہیں۔ اکبر سے شاہجہان تک کا زمانہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ اس دور میں نظم و نثر میں تقریباً ہر موضوع پر سرمایۂ شعر و ادب وجود میں آیا۔ اس دور میں جو شاعر اور نثر نگار موجود تھے ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ یہ موضوع بہت تفصیل طلب ہے اور چونکہ ہمارے موضوع بحث سے متعلق بھی نہیں اس لئے اس دور کے چند مشہور و معروف شعرا و ادبا کے نامون پر اکتفا کی جاتی ہے۔ بیرم خان، فیضی، رحیم خان خانان، غزالی مشہدی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، ظہوری ترشیزی، صائب اصفہانی، قدسی مشہدی، منیر، طالب آملی، کلیم ہمدانی، ابوالفضل اور عبدالقادر بدایونی کے نام تعارف کے محتاج نہیں۔

عہد عالمگیر میں شعر و ادب کا وہ ماحول نہ رہا جو اس سے قبل کے ادوار میں نظر آتا ہے۔ پھر بھی چند ممتاز شعرا و ادیبوں کے نام جیسے ناصر علی سرہندی، نعمت خان عالی، عبدالقادر بیدل، سعید اشرف، خالص اصفہانی، سرخوش وغیرہ

قابل ذکر ہین ۔ چونکہ ہمارا موضوع بحث دور متاخرین کی نثر نگاری ہے اس لئے اس دور کے نثر نگارون مین سرخوش ، عالی ، بیدل اور خود عالمگیر کا نام لیا جاسکتا ہے ۔ بیدل سبک ہندی کے سب سے بڑے اور نمائندہ نثر نگارون مین تھے ۔ جبکہ اسی عہد مین عالمگیر نے اپنے خاوا مین سادہ نثر نویسی کی روایت کو برقرار رکھا تھا ۔

مجموعی طور پر دور متاخرین کی نثر بہ استثنائے چند سبک ہندی کی خصوصیات سے عبارت ہے ۔ دور متاخرین مین یہ خصوصیات نثر نگاری اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھین ۔ دور متاخرین کی مرصع ، مسجع اور مصنوع طرز تحریر کو معراج کمال پر پہنچانے والا نثر نگار ظہوری ترشیزی تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے تتبع اور تقلید مین اکثر نثر نگارون نے اپنی صلاحیتین صرف کین ۔ اس طرز نگارش کی نثر نگاری نے فارسی نثر کو بے حد ثقیل ، بوجھل اور غیر فطری بنا دیا تھا ۔ قدرتی طور پر ان کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنا بھی دشوار سے دشوارتر ہوتا گیا ۔ سادہ سی بات بھی پیچیدگی ، اطناب اور طول کلام کے ساتھ بیان کی جانے لگی ۔ مضمون مین جدت پیدا کرنے کے لئے ایہام ، تشبیہات و استعارات کا استعمال کثرت سے کیا جانے لگا اور خیال بندی اور مضمون آفرینی سے بھی کام لیا جانے لگا ۔ سلاست ، روانی اور فصاحت کی جگہ صنایع و بدایع اور دیگر محاسن ادبی نے لے لی ۔ مشکل پسندی اور دقت پسندی کی یہ روایت اتنی عام ہوئی کہ سادہ نویسی کا رواج ہی ختم ہوگیا ۔ اور اسی قسم کا اسلوب تحریر "سبک ہندی" کے نام سے مشہور ہوا ۔ اگر اس دور کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو غالباً" ہر نثر نگار کے یہان یہ خصوصیات تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ مل جائین گی ۔ اس طرز خصوصی کے

نمایندہ نثر نگاروں میں لہوری اور بیدل کے نام سر فہرست ہیں ۔

سبک ہندی کی یہ روایت عہد عالمگیری کے بعد بھی برقرار رہی اور نثر میں علمی و ادبی کتابیں یعنی تاریخ ، تذکرہ علم عروض و بیان و بدیع اور لغت و شرح نویسی پر مشتمل کتابیں وجود میں آتی رہیں جیسے غلام علی آزاد اور والہ داغستانی کے تذکرے ، شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت اور مختلف موضوع پر لکھی گئی کتابیں اور شرحیں جن کے مصنف خان آرزو تھے ۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی زبان و ادب بھی تنزل کی طرف مائل ہوگیا جس کا سبب بیشتر سیاسی اور سماجی حالات تھے ۔ تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات مروجہ زبان و ادب کی تبدیلی کا باعث بن رہے تھے ۔ لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود فارسی زبان و ادب کی روایت انیسویں صدی کے وسط تک برقرار رہی اور فارسی زبان اہل علم و ادب کی زبان تصور کی جاتی رہی ۔ اس دور کا ہر بڑا شاعر و ادیب فارسی زبان میں شعر کہنا یا نثر لکھنا اپنے لئے بڑی شان اور امتیاز کی بات سمجھتا تھا ۔ ان بڑے شاعروں اور ادیبوں جیسے غالب ، مومن ، آزردہ ، شیفتہ وغیرہ کے ساتھ صہبائی کا نام بھی آتا ہے ۔ صہبائی کے علم و فضل کا ہر شخص معترف ہے ۔ فارسی زبان و ادب سے ان کو دلی لگاؤ تھا ان کے علم و فضل اور ان کی قابلیت و صلاحیت نیز فارسی ادب سے ان کی بے پناہ دلچسپی کے نتیجے میں صہبائی نے کئی علمی و ادبی شاہکار پیش کئے جو اس دور کے سبک یعنی سبک ہندی کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ اپنی ان تصانیف میں انھوں نے سبک ہندی کے مشہور و معروف شاعر و نثر نگار لہوری اور بیدل کا تتبع کیا ہے چونکہ اس باب میں موضوع بحث صہبائی کی طرز نگارش تھی میں وہ دور متاخرین کی پیروی کرتے ہیں نیز سبک ہندی میں لکھی گئی ان کی تصانیف سے مثالیں پیش کرنا ہمارا مقصد ہے اس لئے اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں ۔

نثر نگاری میں صہبائی کا اسلوب نگارش

اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صہبائی اپنے عہد کے فارسی کے ملم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے ۔ چونکہ ان کے دور تک پیچیدہ انشا پردازی اور مشکل گوئی کی روایت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور مرصع ، مسجع اور پرتکلف نثر لکھنے کی رو عام ہوچکی تھی اس لئے اگر کچھ تو میں طبع سے مجبور ہوکر اور کچھ تقلیداً انہوں نے بھی پرتکلف اور مرصع نثر نگاری کے نمونے پیش کئے ۔ انیسویں صدی یعنی غالب اور صہبائی کے دور میں نصاب تعلیم کی کتابیں بیشتر متاخرین کے ان آثار و تالیفات پر مشتمل ہوتی تھیں جن میں اشکال و اغلاق ترصیع اور تعقید لفظی و معنوی جیسے عناصر غالب دور پر مستزاد تھے مثلاً انشائے ابوالفضل ، سہ نثر ظہوری ، رقعات بیدل ، انشائے طاہر وحید وغیرہ وغیرہ ۔

چونکہ صہبائی کا ابتدا سے ہی فارسی زبان و ادب سے واسطہ رہا تھا یعنی ابتدا میں وہ گھر پر ہی درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن بعد میں ان کا تقرر دہلی کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ہوگیا تھا لہذا ہمیشہ ہی ان کے مطالعے میں مختلف انشا پردازوں کی مرصع نثر نگاری کے مختلف نمونے رہتے تھے ۔ لیکن ان سب میں ظہوری اور بیدل کی نثر سے وہ خوب اور بہ متاثر ہوئے چنانچہ ان کی نثر میں ہم کو ظہوری اور بیدل کا رنگ بھی زیادہ نظر آتا ہے ۔

صہبائی کی نثر کا مرصع ، مسجع مقفی انداز ہی ان کی نثر کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ وہ اکثر پیراگراف کی ابتدا طویل جملوں سے کرتے ہیں لیکن بعد میں وہ جملے مختصر سے مختصر تر ہوتے جاتے ہیں ۔ بعض اوقات فعل بھی حذف کردیتے ہیں یا دو جملوں کے لئے ایک فعل سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ عبارت

مین دوسرے صنایع لفظی و معنوی کا التزام بھی کرتے ہین جس سے فارسی زبان و بیان پر ان کی قدرت اور علم بیان و کلام سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نئی نئی تراکیب کی ایجاد اور ان کا خوبصورت استعمال بھی صہبائی کی نثر نگاری کی خصوصیت ہے۔ نہ صرف ریزۂ جواہر بلکہ اپنی دوسری تخلیقات مین بھی نئی نئی تراکیب وضع کین جن مین شگفتگی کے ساتھ ساتھ نیا پن بھی ملتا ہے۔ نثر لکھتے ہوئے بیچ بیچ مین اشعار لکھنا بھی ان کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ دراصل نثر کے درمیان کہین کہین اشعار کے خوبصورت استعمال سے نہ صرف عبارت مین حسن پیدا ہوجاتا ہے بلکہ بات کی تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ خصوصیت ظہوری اور بیدل کے یہان بھی بہ کثرت پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ صہبائی کی نثری نگارشات پر ان دونون انشا پردازون کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے لہذا صہبائی کے یہان اس خصوصیت کا پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہین۔

ذیل مین ہم ان کی تحریرون سے چند مثالین درج کرتے ہین جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی طرز تحریر کے مالک تھے اور یہ کہ ان کی نثر مین نئی تراکیب کا استعمال نیز صنایع لفظی و معنوی کا استعمال کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

" بعضی ازان غازۂ طرز خامۂ راقم بر رو دارد و بعضی بوضع دیگر سر از جیب ظہور بر می آرد اینجا خامۂ غور تامل بجز زبان جوہر نگاہ چہ خواہد بود و نتیجۂ صرف اوقات غیر از نامہ سیاہیہا چہ خواہد نمود شرم بی اعتباری عاقبت حروف را بنم عرق گل میگرداند حیرت وضع این تماشا در لغزش پای نگاہ بی اختیار است و خجلت بر حاصلی خاطر را سراپا کسوت مدآہ می پوشاند حیرت فروشی مطالعۂ

این سواد از خمیازهٔ آغوش مژگان ناخار است ـ ....."[1]

مندرجہ بالا سطرون مین دارد اور آرد یا بود اور نمود یا نگاہ بیراختیار ست اور مژگان ناخار ست مین صنعت سجع نثری ہاتی ہے ـ قافیہ کی رعایت بھی رکھی گئی ہے ـ " زبان جوہر نگاہ " اور " لرزش پای نگاہ " نئی تراکیب ہین جن کا استعمال صہبائی نے بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے ـ مختصر یہ کہ مندرجہ بالا عبارت مرصع مقفی اور مسجع ہی نہین بلکہ اس مین نئی تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے ـ ذیل مین ایک اور عبارت نمونے کے طور پر دی جارہی ہے ـ

" ....آتش افروزی گرمیہای عشق شراری در سینہ زار آبلۂ دل نہ انداختہ کہ اخگرہای داغ دل تا سینہ برہم نخسند ـ و نمک ریزی شور محبت نمکدانی برجگرہا نشکستہ کہ شور خندۂ زخم بعلاج گری گوش نہ نشیند خامہ را بوسیلۂ تحریر این غزل آہی از درد محبت بر لب آوردن ست ـ و از آواز صریر نالۂ بیتابی عشق در بغل پروردن ـ

گل خون شدۂ حسرت انداز کہ گردید
نرگس خجل از چشم فسون ساز کہ گردید
داند کہ دم عیسی مریم ہمہ باد ست
دل زندہ ندانم کہ باعجاز کہ گردید
یا رب بامید کہ چنین رو بقفا شد
صہبائی سرگشتہ بآواز کہ گردید "[2]

۱ـ کلیات صہبائی ، ص ۵۳
۲ـ کلیات صہبائی ص ۶۰ ، ۶۱

پوری عبارت مسجع مرصع ، اور مقفی ہے ۔ نہ چند اور نہ نشیند کو قافیہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ۔ آخری جملے میں فعل حذف کر دیا ہے اور اس سے قبل کے جملے کے فعل سے استفادہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ صنائع لفظی و معنوی کا بھی التزام رکھا ہے جیسے آتش ، شرارہ ، آبلہ ، اخگر میں صنعت مراۃ النظیر پائی جاتی ہے اس کے علاوہ دل ، سینہ ، جگر ، کوہ میں بھی صنعت مراۃ النظیر ملتی ہے ۔

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات ان کی تحریر " بیاض نوں بیام " سے لئے گئے ہیں جو ان کی تصنیف کردہ دیباچے ، خواتیم ، تقاریظ اور مکتوبات پر مشتمل ہے ۔ دوسرا اقتباس " تعریف روزۂ منورۂ حضرت جلال تھانیسری " سے لیا گیا ہے ۔ حضرت جلال تھانیسری[۱] تھانیسر کے ایک بزرگ تھے جن کی وفات ۹۸۹ھ میں ہوئی تھی ۔ حضرت شیخ عبد القدوس کے خلیفہ تھے ۔ ان سے صہبائی کو خاندانی عقیدت تھی کیونکہ صہبائی کا آبائی وطن تھانیسر ہی تھا اس لئے عقیدت کے طور پر وہ ان بزرگ کا حال لکھنا چاہتے تھے لیکن روزۂ منورہ کی تعریف کے آگے نہ لکھ سکے ۔

مندرجہ ذیل عبارت ان کے ایک مکتوب سے لی گئی ہے جو انہوں نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے پورا خط صنعت سجع ، مبالغہ اور صناعی سے آراستہ ہے ۔ کہنا صرف اتنا چاہتے ہیں کہ دوست کی جدائی میں حالت غیر ہے ۔ دوست کا خط ملنے سے اگرچہ کچھ دیر کے لئے انتظار کی مشقت ختم ہو گئی تھی لیکن فوراً ہی شوق غالب آگیا اور دوسرے خط کا اشتیاق عروج ہو گیا ۔ جیسا کہ ان کی نثر نگاری کی خصوصیت ہے کہ نثر کے درمیان اشعار کی پیوند کاری کرتے جاتے ہیں چنانچہ یہاں میں اشعار کے ذریعے اپنے مطلب کو واضح کرتے ہیں ۔

---

۱ ۔ تاریخ مشائخ چشت ، ص ۲۶ ۔ ۲۲۴

نفسی از سینه بر نمی آید که بوئی نو نیشتر در آستین ندارد و غیر از کاو کاو جگر بسم نتواند رسید ـ و حرفی از لب پرده نمیکشاید که هزار درد دل مشتمل نباشد جز در مدد آزار بوئی نتواند گردید نفسهارا بی تحرب مثل بور هزار ناله در بغل پرورد نیست ـ و حرفهارا بی تکلیف الم زحمت سامعه از جیب بر آوردن کاس زحمت مفارقت پردهٔ آرزو بر نمیداشت تا یکتائی مشربان خلوت آشنائی بوهم این همه جدائی نمی افتادند ـ و تطاول مهاجرت چندان از قرب بساط حضور دور نمی انداخت تا تسلیم نگاران صفحهٔ اتحاد این قدر دادنامهٔ و پیغام نمیدادند ....

ناله ام را چه سرمه داد ادب

خامشی از صدا نمی داند

دل که پروردهٔ فریب صباست

هجر و وصلت جدا نمی داند

ورود مخلص نواز نامه بیازین از گرانباریهای مشقت انتظار اندکی سبکدوش گردانیده بود بیصبریهای نو خام لمن باز بر بیقراریهای سابق افزود ....."[1]

مندرجه بالا چند مثالون سے ان کی خصوصیات نثر نگاری کا اندازه بخوبی ہوجاتا ہے ـ دراصل اس دور مین علم و فضل کی نمایش کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اس لئے تراکیب اور صنائع بدایع سے مملو اور مقفی اور مسجع عبارت کی حامل نثری تصنیف کا شمار اعلی تصانیف مین کیا جاتا تھا ـ صہبائی جن کا شمار اسی عہد کے اعلی مرتبہ

۱ـ کلیات صہبائی ، ص ۱۴۰

شعرا اور نثر نگاروں میں ہوتا تھا اور جن کے علم و فضل کا ہر شخص معترف تھا ، مگر ان خصوصیات سے دامن بچا سکے تھے ۔ لہذا صہبائی کی جتنی بھی نگارشات علمی خواہ وہ علمی و ادبی ہوں یا تحقیقی و تنقیدی ، ان سب میں مندرجہ بالا خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔

ہندوستان کے روایتی اسلوب نگاری میں صہبائی کی نمائندگی خصوصی حوالوں کے ساتھ ۔

صہبائی کی نگارشات علمی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔ ادبی ــــ ریزۂ جواہر ۔ بیاض شوق پیام (دیباچے ، خواتیم ، تقاریظ ، مکتوبات)

۲۔ تحقیقی و تنقیدی ــــ رسالۂ نحو فارسی ۔ کافی در علم قوافی مع وافی شرح کافی ۔ رسالہ نادرہ ۔ گنجینۂ رموز مخزن اسرار ۔ نتائج افکار ۔ غواص سخن ۔ رسالہ مناقشات سخن ۔ رسالۂ قول فیصل ۔ اعلاء الحق ۔

صہبائی کی نثری نگارشات چند علمی کتابیں اور رسالوں پر مشتمل ہیں ۔ " ریزۂ جواہر " ان کی خالص ادبی تصنیف ہے جو طہوری کی سہ نثر کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری ادبی تصنیف " بیاض شوق پیام " کو کہا جاسکتا ہے ۔ بیاض شوق پیام میں ان کے چند رسالوں کے دیباچے اور خاتمے شامل ہیں ۔ ان کے دور کے کچھ مایۂ ناز ادیبوں کی تصنیفات پر تحریر کی گئی ان کی تقاریظ بھی ہیں اور مکاتیب بھی جن کا شمار حسن عبارت اور انشا کے اعتبار سے ادبی شاہکاروں میں ہوتا ہے ۔

ان کتابوں یا رسالوں کے موضوعات اکثر و بیشتر تحقیق لغات ، عروض و

قافیہ ، دستور زبان فارسی ، مصطلحات ، محاورات اور ضرب الامثال ، معمیات اور علم شعر و فن بدیع سے متعلق ہیں ۔ فن معما میں صہبائی کو خصوصیت کے ساتھ درک حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ معمائی کہلاتے تھے ۔ اس کے علاوہ ان کی تالیفات ان شرحوں پر مبنی ہیں جو انھوں نے مختلف اساتذۂ فن کی تصانیف پر لکھی ہیں ۔ اور جن کا ذکر ان کی شرح نگاری کے ضمن میں آئے گا ۔

صہبائی کی دو علمی تصانیف ریزۂ جواہر و بیان شوق پیام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ان کے مختصر رسائل پر روشنی ڈالی جائے گی جس سے صہبائی کے علم و فضل اور ان کی قابلیت اور فضیلت ، جو وہ فارسی زبان و ادب میں رکھتے تھے اندازہ ہوسکے گا ۔

ریزۂ جواہر ۔ (ص ٦ تا ٥٢)

ریزۂ جواہر امام بخش صہبائی کی خالص ادبی تصنیف ہے جو ٤٧ صفحات پر مشتمل ہے ۔ حاشیے پر خود صہبائی کی لکھی ہوئی مختصر شرح ہے ۔ سہ نثر ظہوری کی طرز پر لکھی گئی یہ عبارت رنگین اور مرصع ہے جیسا کہ کلیات کے مولف منشی دین دیال کہتے ہیں ۔

" نظم و نثر نہایت پاکیزہ بعبارت رنگین بر طرز سہ نثر ظہوری در مدح سراج الدین بہادر شاہ "۔[1]

ریزۂ جواہر کو صہبائی کا اہم ترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے ۔ ان کو اپنی اس تصنیف پر فخر تھا ۔ سرسید اس رسالے کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

" ایک نثر مسمی بہ ریزۂ جواہر سلطان عہد واسئ عصر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کی مدح میں اس آب و تاب کے ساتھ

---

١ ۔ کلیات صہبائی جلد اول ، ص ٢

ریختہ قلم نزاکت رقم کی ہے کہ اگر رشک و حسد ہم عہدی چشم پوش نہ ہو تو اس کی جلوہ گاہ میں سہ نثر ملا نور الدین ظہوری کو ہرگز پردۂ خفا سے جلوہ گر نہ کریں اور ظہوری کو اس عہد میں خفائی بنا دیں "۔[1]

چونکہ صہبائی کے زمانے میں متاخرین کی نظم و نثر کی پیروی کی روش عام تھی طرز تحریر کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ موضوع اور مطالب کے اعتبار سے بھی متاخرین کے شہ پاروں کی تقلید اور ان کے ہم پلہ کوئی علمی و ادبی شاہکار پیش کرنا علمی لیاقت کی معراج تصور کی جاتی تھی لہذا صہبائی نے بھی اس روایت سے انحراف کئے بغیر اپنی علمی و ادبی استعداد کے اظہار کے لئے ظہوری جیسے مشہور و معروف شاعر و نثر نگار (جس کی ادبی حیثیت اس دور میں مسلم تھی) کا مشہور ادبی شاہکار یعنی سہ نثر کی تقلید میں ریزۂ جواہر لکھنا پسند کیا اور اس طرح اپنی علمی و ادبی صلاحیت اور قابلیت کا ثبوت پیش کیا ۔ ظہوری کی سہ نثر دوسرے ادبی و علمی شاہکاروں کے ساتھ اس وقت کے فارسی کے نصاب تعلیم میں شامل تھی

" سہ نثر ظہوری " دراصل ظہوری کے لکھے ہوئے تین دیباچوں کے مجموعے کا نام ہے ۔ زمانے کی دستبرد کے ہاتھوں یہ دیباچے اصل کتاب سے الگ ہوگئے اور اتفاق ایسا ہوا کہ وہ اصل کتابیں تو گم نامی میں پڑ کر چشم عالم سے روپوش ہوگئیں لیکن یہ دیباچے اپنی مخصوص طرز کی بنا پر زندہ و جاوید ہوگئے ۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کے جوہر کھلتے گئے چنانچہ جب وہ ایک ساتھ مدون و منطبع ہوئے تو ان کا مجموعی نام " سہ نثر " قرار پایا ۔[2]

---

۱ ۔ آثار الصنادید ، ص
۲ ۔ تحقیقی مطالعے ، ص ۹۱ ، ۹۲

" سہ نثر " کے مصنف ظہوری کا اصل نام نورالدین تھا ظہوری تخلص تھا ۔ ترشیز (خراسان) مین ولادت ہوئی ۔ اس دور کے کچھ دوسرے مشہور شاعرون کی طرح ہندوستان کی کشش اسے بھی یہان کھینچ لائی تھی ۔ یہان پر اس نے والیٔ احمد نگر اور والیٔ بیجاپور کے دربار مین رسائی حاصل کی ۔ کچھ مدت تک عبدالرحیم خان خانان سے بھی منسلک رہا ۔ ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور اس کا بہت قدردان تھا ۔ دراصل سہ نثر ابراہیم عادل شاہ کی کتاب " نورس " جو علم موسیقی سے متعلق تھی اور دکنی زبان مین لکھی گئی تھی (جس کا فارسی مین بھی ترجمہ ہوا تھا) پر لکھے گئے تین دیباچون کا نام ہے ۔ اصل کتاب کی گمنامی پر ان دیباچون کو جمع کرکے "سہ نثر " نام رکھ دیا گیا ۔ " سہ نثر " کی صرف عبارت ہی مرصع اور مقفی نہین بلکہ جملے بے حد طویل اور صنایع و بدایع سے مملو ہین ۔ مثال کے طور پر ذیل مین سہ نثر کا ایک جملہ لکھا جاتا ہے جو بےحد طویل ہے اور جس مین صنعتون کا استعمال بھی بہ کثرت کیا گیا ہے ۔

" سرود سرایان عشرت کدۂ قال کہ بنورس سرا بستان حال کار کام و زبان ساختہ بشہد ثنائے صانع عذب البیان اند کہ نغمہائے شکرین در رگ و پے دوانیدہ "۔

ظہوری کے اس شاہکار کی طرز پر نثر لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ یہ مشکل اور وقیع کام صہبائی جیسے صاحب علم و فضل اور باکمال شخص ہی کر سکتے تھے ۔ ظہوری کے دور کو تقریباً ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی صہبائی نہ صرف ظہوری کی طرز تحریر سے بے پناہ متاثر ہوئے بلکہ ظہوری کی طرز تحریر کی ساری خصوصیات کو اپنی تحریر مین بعینہ اپنانے کی کوشش کرتے ہین اور ایک حد تک

اپنے مقصد مین کامیاب بھی ہوتے ہین۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہین کہ " ریزہ جواہر " مین صہبائی کا طرز تحریر بھی وہی مرصع ، مسجع اور مقفی طرز تحریر ہے جو کہ ظہوری کی سہ نثر مین پایا جاتا ہے۔ نہ صرف طرز نگارش بلکہ مضمون کے اعتبار سے بھی " ریزہ جواہر " اور " سہ نثر ظہوری " مین مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ظہوری "سہ نثر" مین ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی مدح کرتے ہین تو صہبائی "ریزہ جواہر" مین سراج الدین بہادر شاہ کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہین۔ جس طرح ظہوری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تعریف مین اس کی اتباع شریعت ، شان و شوکت ، عدالت و شجاعت ، سخاوت ، صورت و سیرت اور کمالات کے اظہار مین زور بیان صرف کیا ہے اسی طرح صہبائی نے اپنے ممدوح بہادر شاہ کی اتباع شریعت ، سخنوری ، عیش و عشرت ، سخاوت و شجاعت اور عدالت کی مدح مین اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہین۔ ذیل مین دونون انشاپردازون کے شاہکارون سے کچھ نمونے پیش کئے جارہے ہین جس مین وہ اپنے ممدوحین کی تعریف مین قلم آزمائی کرتے ہین۔

ظہوری اپنے ممدوح کی شجاعت کی تعریف ان الفاظ مین کرتے ہین ــــ

" بحدیث نیروی بازویش حکایت سر پنجه شیر ژیان کام و زبان مردم شکسته و برمانده صفت رزمش گوش از استماع داستان هفت خوان رستم سیر نشسته ببازوے توانا دم تیغش بر تارك گردون شگاف انداز و بشست صاف نوك پیکانش در پشت قاف ناف ساز نهیبش اگر در جواب بر عدو شبخون برد عجب که در بداری سرازان

ورطه بیرون برد اند از کمند شیر بند ش از کمند طرهٔ سلسله مویان تاب برده و دستهٔ تشنه بخون اعدایش با تیغ غمزهٔ خوبان در یك کارخانه آب خورده زخمهای کاری .....»[۱]

شجاعت کے ہی موضوع پر صہبائی لکھتے ہین ـــ

« جرأت را از طبع شیر بشکایت ضیق مکان در حوصله اش راه جستن و توانائی را از سر پنجهٔ هزبر بشکوهٔ تنگی جا در منظر دستش بفراغ نشستن در وصف مهابتش صریر خامه با نعرهٔ شیر هم آهنگ و در مدح شجاعتش نوك قلم با ناخن هزبر یکرنگ رستم از بیم شبخونش هر نفس از خواب عدم جسته و بهمن از هیبت حمله اش در نهانخانهٔ گور آمادهٔ گریز نشسته شکل سنانش برشانهٔ ضحاك افعی نما و نوك نیزه اش از دست سلیمان انگشتر ربا ظفر را نام شمشیرش چون دعای سیفی بر زبان ست ....»[۲]

ایك دوسری جگه اپنے ممدوح کی سیرت پسندیده و اطوار برگزیده کے بارے مین ظہوری لکھتے ہین ـــ

« صاحب خلق و کمال جامع صفات جلال و جمال بمطالعهٔ تالیف الفتش بیگانگان شارح متن آشنائی و برجادهٔ پیروی پیشرو یش خضر تشنهٔ وادے رهنمائی آب سحاب تد بیرش نشانندهٔ غبار لجاج و عناد و هم رو یانندهٔ نهال صلاح و سداد ریزه خواری خوان همتش اکسیر نعمت ....»[۳]

۱ـ سه نثر ظهوری ، ص ۲۷
۲ـ کلیات صهبائی ، جلد اول ، ص ۳۵ ، ۳۶
۳ـ سه نثر ظهوری ، ص ۳۱ ، ۳۲

صہبائی اپنے ممدوح کی سخاوت کی تعریف مین رقمطراز ہین ــــ

" در طوفان محیطش عطایش دامن آرزو از موج گوہر گرداب و از طغیان سیل سخایش وسعت چاہ حرص تنگی ظرف حباب در نیسان گہر ریزی کف جوادش را اشارت امساک صدف در انگشت و در بہارستان زر بخشی شگوفۂ دستش را محضر بخل غنچہ در مشت گرمی آفتاب ہمت بخاری از محیط کفش بر انگیخت ابر نیسان بر آورد ند ....."[1]

مندرجہ بالا مثالون مین دیکھا جاسکتا ہے کہ دونون انشا پردازون کے یہان نہ صرف نازکیٔ خیال ، نادر تشبیہات و استعارات ، نئی تراکیب اور صنائع بدایع کی کثرت ہے بلکہ پوری تحریر مسجع مرصع اور مقفی ہے ــ اپنی طرز تحریر مین ان خصوصیات کا استعمال انھون نے کچھ اس سلیقہ اور خوبی سے کیا ہے کہ عبارت مین موسیقی اور تحریر مین رنگینی پیدا ہوگئی ہے ــ

مجموعی طور پر دونون نثر نگارون کی تحریرون مین مشترکہ طور پر مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہین ــ

۱ــ دونون کے یہان صنعت سجع کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ــ

۲ــ نہ صرف صنعت سجع بلکہ اپنے ممدوحین کی تعریف مین دونون انشا پرداز لفظی و معنوی رعایتون کا استعمال بڑی خوبی اور قادر الکلامی سے کرتے ہین ــ

۳ــ دونون کے یہان طویل جملون کا استعمال تحریر کی خوبی سمجھا گیا ہے ــ پیراگراف کی ابتدا طویل جملون سے کرتے ہین ــ بعد مین جملے مختصر ہوتے جاتے ہین ــ بعض اوقات ان کے افعال بھی حذف ہوجاتے ہین ــ

۱ــ کلیات صہبائی ، جلد اول ، ص ۳٤

٤۔ نئی نئی تراکیب کا استعمال اور نئے فقرات کی ایجاد بھی دونون انشا پردازون کی خاص خوبی ہے۔

۵۔ دونون کے یہان موضوع سخن اور خیالات کی یکسانی کے ساتھ ساتھ ان کی ہئیت مین بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

دونون انشا پردازون کی نثر نگاری کے نمونون کو بغور پڑھنے کے بعد فارسی زبان و ادب سے واقفیت رکھنے والا ہر ذی فہم اس بات سے انکار نہین کرسکتا کہ باوجود اس کے کہ ظہوری اہل زبان اور استاد فن ہین ، صہبائی بھی قدرت کلام اور لطف بیان مین ان سے کم نہین۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہین کہ صہبائی نے حسب روایت اگرمتاخرین مین سے کسی استاد فن (ظہوری) کی پیروی کی تو وہ اپنی اس کوشش مین کامیاب رہے ہین، ناکام نہین۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ظہوری کے معیار تک نہین پہنچ سکے۔ ذیل مین پروفیسر خواجہ محمد حامد ظہوری کی تقلید مین صہبائی کی اس کوشش کے بارے مین یون رقمطراز ہین ــــ

" ظہوری کی سخن طرازی سحر حلال ہے۔ سلک مروارید کی سی نثر مرجز مین فقرون کی نشست اور جملون کی ہئیت ، تراکیب کی شعریت اور تخئیل کی رفعت ، پھر خیالات و جذبات سے مل کر سب کی ہم آہنگی اور اثر نمائی ارباب ذوق کے لئے وجد آفرین ہے۔ جو شخص اس نثر کا جواب لکھنے کی کوشش کرے وہ ضرور داد کا مستحق ہے لہذا صہبائی قابل تحسین ہین کہ انھون نے ظہوری کا مقابلہ کیا اور خوب مقابلہ کیا وہ ظہوری کی سطح تک نہین پہنچ سکے تو مضائقہ نہین۔ کوئی اور انشا پرداز بھی اس سطح تک نہین پہنچ سکا "۔[1]

۱۔ امام بخش صہبائی ، ص ۱۱۹

صہبائی کی ظہوری کی تقلید مین لکھی گئی نثر " ریزہ جواہر " صہبائی کی ذہانت ، وسیع مطالعہ ، فارسی زبان و ادب سے گہری دلچسپی اور قدرت بیان کا بین ثبوت ہے ۔

بیاض شوق پیام ۔

بیاض شوق پیام ان کی دوسری ادبی تصنیف کہی جاسکتی ہے ۔ " بیاض شوق پیام " ۱۲۷۲ھ سے اس کی تاریخ بھی نکلتی ہے ۔ بیاض شوق پیام کے عنوان سے کلیات کی فہرست مین مندرجہ ذیل عبارت درج ہے ۔

" بیاض شوق پیام ۔ نثرہاے متفرق و دیباچہ ها و خواتیم شروح و رسائل و تقاریظ نظم و نثر و مکاتیب نثر و رقعات که هر یك در حسن و خوبی عبارت نظیر خود ند ..."[1]

بیاض شوق پیام کے بارے مین منشی دین دیال اپنی تقریظ مین لکھتے ہین ۔

" فروغ معانی بیاض شوق پیام چراغی در شاهراه طرز بیدل نهاده ۔ "[2]

بیاض شوق پیام مین مندرجہ ذیل مشمولات شامل ہین ۔

۱۔ تعریف روضۂ منورہ حضرت جلال تھانیسری ۔

۲۔ بہارستان تخئیل

۳۔ دیباچۂ بیاض اشواق

۴۔ دیباچۂ نسخہ اعلاء الحق

۵۔ تقریظ تذکرۂ گلشن بے خار

۱۔ کلیات صہبائی ص ۲

۲۔ ایضاً ص ۸۰۷

۶ـ دیباچهٔ شرح ظهیرای تفرشی

۷ـ خاتمهٔ شرح ظهیرای تفرشی

۸ـ دیباچهٔ شرح رسالهٔ منظوم موسوم معمیات

۹ـ خاتمه شرح نسخه رسالهٔ معمای منظوم

۱۰ـ دیباچه شرح حسن و عشق نعمت‌خان عالی

۱۱ـ خاتمه شرح حسن و عشق نعمت‌خان عالی

۱۲ـ دیباچهٔ تلخیص حل مقامات نصیرای همدانی

۱۳ـ خاتمهٔ تلخیص شرح مقامات نصیرای همدانی

۱۴ـ دیباچهٔ شرح مختصر جواهر الحروف

۱۵ـ دیباچه شرح سه نثر ملا نورالدین ظهوری

۱۶ـ خاتمهٔ شرح دیباچهٔ نورس

۱۷ـ دیباچهٔ گلزار ابراهیم

۱۸ـ خاتمه شرح گلزار ابراهیم

۱۹ـ دیباچهٔ شرح خوان خلیل

۲۰ـ خاتمهٔ شرح خوان خلیل

۲۱ـ دیباچهٔ قواعد فارسی موسوم به گلزار سخن

۲۲ـ دیباچهٔ حل مقامات نسخهٔ جواهر الحروف ٹیک چند بهار

۲۳ـ تقریظ صفیر بلبل انشای مولوی عبدالله خان صاحب علوی

۲۴ـ دیباچهٔ شرح مینا بازار

۲۵ـ خاتمهٔ شرح مینا بازار

۲۶ـ دیباچهٔ شرح پنج رقعه

۲۷۔ خاتمۂ شرح پنج رقعہ ظہوری

۲۸۔ دیباچۂ قول فیصل در جواب رسالہ تنبیہ الغافلین خان آرزو

۲۹۔ خاتمۂ قول فیصل

۳۰۔ تقریظ آثارالصنادید مولفۂ سید احمد خان بہادر

۳۱۔ تقریظ آئین اکبری مصحبۂ سید احمد خان بہادر

۳۲۔ تقریظ دیوان خواجہ حافظ شیرازی (یہ تقریظ کلیات صہبائی حصہ دوم (جلد ثانی) کے آخر مین درج ہے)

۳۳۔ مکاتیب

چونکہ بیاض شوق پیام کے مشمولات کی ایک لمبی فہرست ہے، اگر ان سب کے بارے مین مختصراً بھی لکھا جائے تو یہ باب بہت طویل ہوجائے گا ۔ علاوہ ازین ان مشمولات مین بیشتر دیباچے، خواتیم اور تقاریظ شامل ہین جو صہبائی کے اصل رسالون کے ساتھ بھی ملتی ہین لیکن بعد مین مولف نے ان کو بیاض شوق پیام کے نام سے بھی یکجا کردیا ہے ۔ کچھ تقاریظ جو صہبائی نے اس دور کی چند مشہور تصانیف پر لکھی تھین، وہ بھی اس مین شامل ہین جیسے عبداللہ خان علوی کے خطوط کے مجموعہ "صفیر بلبل" اور سرسید کی مشہور کتاب "آثارالصنادید" ۔ اس کے علاوہ سرسید کی ہی مشہور تالیف "آئین اکبری" پر لکھی گئی تقریظ بھی اس مین شامل ہے ۔ اس دور مین تقریظ نویسی کی روایت عام تھی ۔ کسی بھی مشہور تصنیف یا تالیف پر مشہور اہل قلم حضرات تقاریظ لکھ کر مولف یا مصنف کی کوشش کی داد دیتے اور اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے ۔ نیز زمانے کی روش کے مطابق

۱۔ کلیات صہبائی، جلد اول، ص ۵٤ تا ۲۳٦

اس مختصر تحریر مین اپنے اپنے قلم کے جوہر دکھاتے اور فضل و کمال کی نمایش مین ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے ۔ چنانچہ صہبائی نے بھی حسب روایت اپنے دور کی مشہور علمی کاوشون پر تقاریظ لکھ کر اپنی علمی و ادبی صلاحیتون کا کماحقہ اظہار کیا ہے اور خوب کیا ہے ۔ مجموعی طور پر دیباچے ، خواتیم اور تقاریظ کی تحریر کا انداز وہی ہے جو ان کی دوسری تصانیف مین پایا جاتا ہے ۔

تقریظ نگاری کی روایت غالباً اٹھارویں اور انیسویں صدی کی دین تھی لہذا وہ مکمل طور پر متاخرین کے دور کی نثر نگاری کا نمونہ نظر آتی ہین ۔ صہبائی کی تقاریظ کی عبارت مرصع مسجع تحریر تشبیہ ، استعارہ اور نئی و خوبصورت تراکیب کے استعمال سے مثل ایک خوشنما گلدستے کے نظر آتی ہین جس مین الفاظ کے رنگ برنگے پھول اور کلیان سجادی گئی ہون ۔ نثر کے درمیان اشعار کی پیوند کاری ، جو صہبائی کی طرز نگارش کی ایک خصوصیت سمجھی جاتی ہے ، ہر قسم کی نثر مین ، خواہ وہ کسی موضوع پر ہو ، مختصر ہو یا طویل ، ہر جگہ نظر آتی ہے ۔ ان کی تقریظات گویا عبارت آرائی کا ایک طلسم ہے جس مین قاری کھوسا جاتا ہے ۔ پوری تحریر صنائع لفظی و معنوی سے آراستہ ، صاحب تصنیف کی شان مین ایک قصیدہ بن کر رہ جاتی ہے جس کو نظم کی جگہ نثر مین لکھ دیا گیا ہو ۔ لیکن صہبائی بھی اس قسم کی تحریر لکھنے پر مجبور تھے چونکہ اس وقت کی طرز و روش تحریر ہی کچھ اس قسم کا تھا ۔ چونکہ اس زمانے مین تقریظ نگاری کی روایت عام تھی چنانچہ اس دور کے دوسرے مشہور اساتذہ غالب ، شیفتہ اور علوی وغیرہ نے بھی تقاریظ لکھی تھین ۔ تقریباً سب ہی کا طرز تحریر مرصع و مسجع اور صنائع و بدایع سے مملو ہے ۔

اگرچہ آئین اکبری کے لئے غالب نے بھی تقریظ لکھی تھی لیکن سرسید نے اپنی تالیف آئین اکبری مین غالب کی تقریظ نہین بلکہ صہبائی کی تقریظ کو شامل کیا تھا ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے دل مین صہبائی کے لئے کتنی عزت و احترام تھا اور یہ کہ وہ ان کے علم و فضل کے کتنے قدر دان تھے ۔

تقریظ نگاری کے بعد اب مختصراً ان کی مکتوب نگاری کے بارے مین کچھ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ صہبائی کے مکاتیب ان کی نثر نگاری کا ایک اہم جزو ہین ۔ کلیات صہبائی مین " بیاض شوق پیام " کے عنوان کے تحت صہبائی کے کل مکتوبات کی تعداد ۷٤ ہے جو ۸۵ صفحات پر پھیلے ہوئے ہین ۔

۱۔ چار خطوط کسی دوست کے نام

۲۔ پانچ اپنے استاد عبداللہ خان علوی کے نام

۳۔ سولہ اپنے شاگرد منشی دین دیال کے نام

٤۔ بارہ نواب حیدر حسن خان کے نام

۵۔ تین منشی دھرم نرائن کے نام

٦۔ تئیس ایک بزرگ کے نام

۷۔ چھ مولوی محمد حسین ہجر کے نام

۸۔ پانچ لالہ بلدیو سنگھ کے نام

کم و بیش ہر دور مین فارسی نثری ادب مین مراسلات و مکاتبات اور رقعات کی بڑی اہمیت اور ممتاز حیثیت رہی ہے ۔ یہ مراسلے اور رقعات وغیرہ محض سرکاری فرامین و احکام و دستاویزات وغیرہ کے لئے مخصوص نہین ہوتے تھے بلکہ

ذاتی احوال و کوائف ، شخصی معاملات و واقعات کے اظہار و بیان کا بھی کام کرتے تھے لہذا ان مین ایک طرح کا داخلی عنصر بھی شامل ہوتا تھا ۔

ابتدائی زمانے مین ایران اور اس کے شمال مشرق کے ممالک مین سرکاری زبان فارسی ہی تھی چنانچہ ان کی باہمی مراسلت بھی فارسی زبان مین ہوتی تھی ۔ اکثر اوقات ان مین حرف مدعا سے زیادہ علمیت و قابلیت اور فہم و فراست کا اظہار مقصود ہوتا تھا تاہم ایجاز و اختصار کا لحاظ رکھا جاتا تھا ۔ لیکن جیسے جیسے نثر نگاری مین تصنع اور تکلف کا عنصر بڑھتا گیا اسی اعتبار سے خطوط نویسی مین بھی تصنع اور رنگینی آتی گئی ۔ بالخصوص متاخرین کے عہد مین مزین اور مرصع طرز نگارش نثری تصانیف مین عام نظر آنے لگا یعنی معمولی سی بات کو سادہ اور آسان طریقے سے کہنے کے بجائے ترصیع اور تزئین کے عنصر کی شمولیت اور صنعت کاری کے فن کے ساتھ پیش کیا جاتا ۔ اس قسم کی خصوصیت کو انشا پردازی یا انشا نگاری کا نام دیا جاتا ہے ۔ بنیادی طور پر اس قسم کی طرز نگارش سے اپنی فضیلت علمی اور نثر نگاری پر عبور و دسترس کامل کا اظہار ہی مقصود ہوتا تھا چنانچہ اکثر نفس مضمون پس پشت پڑ جاتا تھا اور محض ظاہری صنعت کاری ، فنی خصوصیات اور الفاظ و فقرات کے بیل بوٹون کی بھول بھلیون مین قارئین کھو جاتے تھے ۔ یہان تک کہ دور تیموریہ اور اواخر دور تیموریہ مین یہ رنگ اپنے عروج پر پہنچ گیا جس کی بہترین مثالین " پنج رقعہ " ظہوری " اور " رقعات بیدل " ہین البتہ اس عہد مین بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے مکاتیب جو " رقعات عالمگیری " کے نام سے مشہور ہین وہ اس دور کی مروجہ طرز انشا سے مختلف ہین ۔ اس وقت کی اسلوب انشا نگاری کے برعکس اورنگ زیب کے خطوط مین آسان تراکیب ، سلیس و روان عبارت ، انداز بیان پرزور اور ایجاز جیسی خصوصیات نے مل کر دلاویزی پیدا کردی تھی ۔

محمد حسین آزاد کے بقول گلستان سعدی اور رقعات عالمگیری مین مشابہت پائی جاتی ہے۔

" .... اسکی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دون تو مضایقہ نہین۔ اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین ہین اور اس کے حالی ، عبارت اس کی ل جتنی پڑھنے مین سہل ہے اتنی ہی لکھنے مین دشوار ہے۔"[1]

چونکہ صہبائی نثر نگاری مین ظہوری اور بیدل کا تتبع کرتے تھے چنانچہ خطوط نویسی کے میدان مین وہ اس روایت یعنی " طرز بیدل " سے کس طرح بچ سکتے تھے یہ ایک حقیقت ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل نے اپنی عظیم شاعری اور عالمانہ نثر نگاری سے صرف صہبائی کو ہی نہین بلکہ بے شمار اہل علم اور ارباب کمال کو متاثر کیا تھا ۔ انھون نے ادب کے میدان مین وہ مقام و درجہ حاصل کرلیا تھا کہ نہ صرف ان کے عہد مین بلکہ زمانۂ ما بعد مین بھی چند ایسی شخصیتون پر ان کی شاعری اور نثرنگاری کے گہرے اثرات مترتب ہوئے جو بذات خود ادب فارسی کی دنیا مین اعلی مقام و مرتبہ رکھتے تھے مثلاً غالب ، صہبائی ، علوی وغیرہ ۔

صہبائی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پچھلے باب مین بتایا جاچکا ہے کہ صہبائی کی شاعری پر بیدل کے افکار و بیان کا کتنا اثر پایا جاتا ہے۔ اس باب مین مختصراً ان کی نثر نگاری کے بارے مین بتایا جارہا ہے۔ بیدل کی شاعری و نثرنگاری دونون نے ہی زمانۂ ما بعد کے شعرا کو متاثر کیا اور انھون نے اپنی نظم و نثر مین اس کا گہرا اثر قبول کیا جیسا کہ پچھلے باب مین صہبائی کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ضمناً بتایا بھی جاچکا ہے کہ غالب جیسے نابغۂ فن بھی ، جو فارسی نظم و نثر مین ایک انفرادی شخصیت اور طرز کے مالک تھے ، وہ بھی ابتدا مین بیدل کے افکار و

۱۔ سخندان فارس حصہ دوم ص ۹۱

خیالات اور طرز نگارش سے بے حد متاثر تھے چنانچہ ایک جگہ بیدل کو " محیط بے ساحل " کے عنوان سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کی طرز نگارش کی تعریف اور ان کی تقلید کا اظہار بھی کئی جگہ کرتے ہیں مثلاً

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

چونکہ یہاں پر ہمارا موضوع بحث غالب نہیں بلکہ صہبائی ہیں لہذا غالب کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ بیدل کے صرف معتقد اور مداح ہی نہیں بلکہ مقلد بھی تھے ۔ صرف غالب و صہبائی اور علوی ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے عظیم اور آخری فارسی شاعر اقبال نے بھی بیدل کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو " مرشد کامل " کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ بیدل اور ان کی تصانیف کا مجملاً ذکر پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے ذیل میں ان کی نثری تصانیف کے نام دئے جارہے ہیں ان کی نثری تصانیف میں صرف تین کتابوں کے نام ملتے ہیں ۔

۱ ۔ چہار عنصر[1] ۔ یہ بیدل کی اہم ترین تصنیف ہے جو چار ابواب اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے ۔

۲ ۔ نکات بیدل[2] ۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو بیدل کے فکر و فلسفے کا نچوڑ ہے ۔

۳ ۔ رقعات بیدل[3] ۔ یہ بیدل کے مکتوبات کا مجموعہ ہے ۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی مثنویوں پر مقدمات بھی لکھے ہیں جو غالباً اس زمانے کی ایک عام روش تحریر تھی ۔ مختصر یہ کہ ان کی طرز نگارش میں سادگی تحریر

---

۱ ۔ کلیات بیدل ، ص ۲۹۸
۲ ۔ ایضاً ص ۲۰
۳ ۔ ایضاً ص ۱۱۵

کی کوئی گنجائش نہین خواہ وہ علمی و ادبی مضامین ہون یا فلسفیانہ مکتوبات ہون ، یا کوئی اور تحریر ، پوری عبارت مرصع مسجع اور بلاغت آمیز ہوتی ہے ۔

ذیل مین بیدل اور صہبائی کے کچھ مکتوبات سے اقتباسات دئے جا رہے ہین جس سے اندازہ ہوگا کہ صہبائی کے مکاتیب پر بیدل کے رقعات اور ان کی طرز نگارش کی جھلک واضح نظر آتی ہے ۔

بیدل اپنے ایک مکتوب مین شاکر خان کو لکھتے ہین ——

" بعد از عرض آداب بندگی و پس از اظہار قواعد تسلیم تسلیم موج اگر تا قیامت بسعی جولان پردازد از کوچۂ شکستگی برآمدن ندارد و ذرہ اگر ہزار سال بال تلاش برہم زند از قفس عجز سر بر نمی آرد خیال معنی یکتائی بہ عبارت دوئی تامل کرد از تصنع پیغام دری بر روی وصل برآوردیم و تصور جمعیت حضور در تفرقۂ وہم دوری افتاد بہ تکلف تحریر نامہ سیاہ کردیم جرأت تقریر معذرت نوا نیست تا بہ علاج تقصیر غفلت توان پرداخت و شوخی تحریر یاس ادب ندارد تا طرح سجدہ نیازی توان انداخت ۔ مارا کہ نہ آرائش برگی نہ نوائی ست

سرمایہ اگر ہست ہمین دست دعائیست

تسلیم بر عنائی افسر نفروشیم

معراج سر آبلہ بوسیدن پائیست [1]

ایک اور خط مین شاکر خان کے منصب مین اضافے کے موقع پر لکھتے ہین ——

"

---

۱ ۔ رقعات بیدل ، ص ۹٤

" هزار آئینه چون طاؤس میخواهد تماشایت

بقدر شوخی رنگی که داری چشم حیران شو

کرشمهٔ فضل ایزدی از آینهٔ ما رنگی بجلوه نمی آرد که اندیشه را غیر از بهار بودن چارهٔ دیگر تواند بود و کیفیتی از ساغر ما عرض نمید هد که تصور را جز خمستان حیرت تخیلی توان پیمود امید بیدلان حضرت صمدیت ظهور مشتاق هزار رنگ مراتبست و جلوهٔ انتظار چندین نثار مناصب عروج این درجات بی نهایت باد"[1]

ایک جگه شکرالله خان کو روغن بادام ملنے پر شکریے کے طور پر لکھتے هین ـ

" بیدلان سخت بی نوایان اند نفس هستی آشنایان اند ـ در طرب زار عالم خم و پیچ یک عرق خجلت اند و باقی هیچ ـ خامه از نارسائیهای طرب تحریر مژگان بلغزش می آورد اشکی بوضع بقطگی چکیدنی و صفحه از بی وسعتیهای بیان برخود پیچیدنی ـ"[2]

صهبائی اپنے کسی دوست کو لکھتے هین ـــ

" قلم در تحریر مراتب شوق سطرها در معرض نقطه میگزارد و خامه در تقریر مدارج تمنا از رشتهٔ لیقه مو از زبان بر می آرد حرفی نخواهد بود که در کسوت صریر قلم فریادی نالهٔ شوق نباشد و نفسی نمیتوان زد که بفغان درد هجران سامعهٔ دور و نزدیک نخراشد

نالهٔ دل دور باشی از ادب فهمیده است

ورنه از لب تا بگوش یار راهی دور نیست

۱ـ رقعات بیدل ، ص ۱٦٤

۲ـ ایضاً ص ۱۰۷

میتواند دست در دامان زدن یک جذبه اش

جلوه می باید دل بیتاب ما معذور نیست "[۱]

ایک اور جگه اسی شاگرد منشی دین دیال کو لکھتے ہین ــــ

" اگر در آرزوی گرد آن آستان گردیدن احرام طواف کعبهٔ بیخودی بامداد هزار رنگ لبیک وارستگی نمیرسید ـ ـ ـ

یہ کہین تو غالباً" بیجا نہ ہوگا کہ مکاتیب صہبائی پر رقعات بیدل کی چھاپ نمایان طور پر نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ان کے شاگرد منشی دین دیال بھی اپنے دیباچے یعنی " واجب العرض مولف " مین کہتے ہین۔

" گلہای متنوعہ طرز متقدمین و متاخرین را جامع آمدہ ،
ہم مشکریزی کاکل انداز بیدل از چین زلف سطورش غالیہ سا ..."[1]

بیدل نے اپنی نثری تخلیقات بالخصوص رقعات اور مکاتیب مین جو مختلف دوستون آشناؤن اور ممدوحین کے نام تحریر کئے تھے ، مناسبات لفظی و معنوی کا استعمال بہت کثرت سے کیا ہے۔ مفاہیم و مطالب سے زیادہ ان کی نثری تخلیقات مین ادبی و لسانی ، لغوی اور صنائع بدایع جیسی خصوصیات زیادہ ملتی ہین۔ انداز بیان فاضلانہ ، عالمانہ اور پیچیدہ ہے۔ شاعرانہ اور مرصع زبان کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے۔ نثر مین کہین کہین اشعار کی پیوند کاری بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

تقریباً" یہی سب خصوصیات صہبائی کے مکاتیب مین بھی پائی جاتی ہین۔ صہبائی کے یہان بھی استعارون ، کنایون ، تراکیب اور صناعات لفظی و معنوی کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ خطوط مین بیچ بیچ مین اشعار کی پیوند کاری وہ بھی بہت سلیقے اور خوبصورتی سے کرتے ہین۔ طرز نگارش مین مماثلت اور یکسانیت کے سبب یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صہبائی کی تحریر پر بیدل کی طرز انشا کا بہت بڑا اثر ہے اور یہ کہ صہبائی کی نثر بالخصوص مکتوبات مین یکسر یا مکمل طور پر بیدل کی تقلید ملتی ہے۔

۱۔ کلیات صہبائی ص ۱

تحقیقی و تنقیدی رسائل ۔

کلیات صہبائی مین دس رسالے بھی ملتے ہین جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہین ۔ جیسے

رسالہ در نحو فارسی ۔

یہ رسالہ کلیات صہبائی مین سترہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس رسالے مین صہبائی نے فارسی زبان کی قواعد کو آسان فارسی مین ترتیب دیا ہے ۔ چونکہ وہ فارسی کے استاد تھے اس لئے جانتے تھے کہ طلبا اگر فارسی زبان کی قواعد سے ناواقف ہونگے تو نہ تو وہ فارسی زبان کو مکمل طور پر سیکھ سکتے ہین اور نہ ہی فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کرسکتے ہین اور چونکہ صہبائی کے زمانے تک جتنی بھی قواعد اور نحو فارسی پر کتابین لکھی گئی تھین وہ طلبا کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد نہ تھین کیونکہ ان کی زبان آسان اور عام فہم نہ تھی ۔ چنانچہ انھون نے اپنے طلبا اور دیگر فارسی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگون کے لئے ایک رسالہ " رسالہ در نحو فارسی " کے نام سے تالیف کیا ۔

کافی در علم قوافی مع وافی شرح کافی ۔

اس رسالے کی ابتدا صہبائی اللہ تعالی کی تعریف مین کہے گئے کچھ اشعار سے کرتے ہین اور دعا کرتے ہین کہ خدا تعالی ان کو اپنے عشق کی توفیق عطا کرے وہ یہ بھی آرزو کرتے ہین کہ اگر اس سرزمین پر ان کی موت واقع ہو تو ان کی خاک کو مدینے لے جایا جائے ۔ پھر اس رسالے کی تالیف کا سبب یہ بتاتے ہین کہ چونکہ اس دور مین شعر گوئی کی طرف لوگون کا رجحان زیادہ ہے ۔ بیشتر حضرات نہ صرف شعر سننے کے شوقین اور اچھے شعر کا ذوق رکھتے ہین بلکہ ذرا بھی طبعیت موزون ہونے پر شعر کہنے سے بھی گریز نہین کرتے (کیونکہ اس زمانے مین دہلی مین

شعر و ادب کا ماحول نیز ادبی محفلین اپنے عروج پر تھین)، لیکن ان مین اکثر حضرات جو شعر کہتے ھین وہ عروض و قافیہ کے اصول اور قواعد سے ناآشنا ھوتے ھین اور شاعری کے لئے صحیح اور مناسب بحرون کا انتخاب اور قافیون کا تعین صحیح طریقے سے نہین کرسکتے تاھم چونکہ طبع موزون کے مالک ھوتے ھین لہذا شعر گوئی شروع کردیتے ھین ۔ ایسے لوگون کے لئے اور اپنے فرزندون کی رھنمائی اور سخن آموزی کے لئے انھون نے ایک ایسی کتاب ترتیب دینے کا ارادہ کیا جس مین اصول عروض و قافیہ پر تفصیل سے بحث کی گئی ھو ۔

اس رسالے کو انھون نے پوری معلومات اور تحقیق کے بعد تالیف کیا ھے اور کسی جگہ بھی بغیر حوالے کے کوئی بات نہین لکھی ھے ۔ اس کتاب کو لکھنے سے قبل انھون نے ان سارے اھل فن حضرات جنھون نے فن عروض و قافیے پر رسالے یا کتابین لکھین، خواہ عربی مین ھون یا فارسی مین ، ان کا بغور مطالعہ کیا اور رسالہ لکھتے وقت ان سے استفادہ بھی کیا ۔

چند مشہور ارباب کمال جو فن عروض و قافیے مین ماھر سمجھے جاتے ھین اور جن سے صہبائی نے استفادہ بھی کیا اور ان کے حوالے بھی دئے ھین ان مین سے چند مشہور اھل فن کے نام ذیل مین دئے جارھے ھین ۔

خلیل بن احمد عروضی ، ابوعلی قطرب ، محقق طوسی (صاحب معیار الاشعار) ، شمس قیس (صاحب حدائق المعجم) ، زمخشری ، مولانا عبدالرحمن جامی ، محمود ابن شیخ محمد گیلانی (صاحب مناظر الانشا) ، رشید الدین وطواط (صاحب حدایق السحر)، شمس فخری اصفہانی ، ابن حاجب ، شمس الدین فقیر (صاحب حدائق البلاغت) ،

امیر خسرو (صاحب رسائل الاعجاز) ۔

اس کے علاوہ اس وقت کی پانچ مشہور فرہنگوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا جیسے فرہنگ جہانگیری ، برہان قاطع ، منتخب اللغات ، وغیرہ ۔

علم عروض اور قافیے پر صہبائی کا یہ رسالہ تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے اس لئے کہ اس علم کے مختلف مسائل ، جن پر عروضیوں کے درمیان اختلاف رائے رہا ہے صہبائی نے اپنی تحقیق کے دوران پہلے بخوبی ان کے نظریات کا جائزہ لیا اور پھر دلائل و شواہد کے ساتھ اپنی رائے کا بھی اضافہ کیا ہے ۔ صہبائی کو اپنی اس تصنیف پر بجاطور پر ناز ہونا چاہئے اس رسالے میں طرز تحریر وہی ہے جس کی صہبائی نمایندگی کرتے تھے ۔ وافی شرح کافی دو صفحات پر کافی در علم قوافی کی شرح ہے جس میں حمد و نعت کے بعد " عرض مولف " بھی ہے ۔

فن معما پر چند رسائل ۔

اب ذیل میں فن معما پر لکھے گئے ان کے چند مشہور رسالے جیسے " رسالہ جواہر منظوم (۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء) ، رسالہ نادرہ (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) ، رسالہ گنجینۂ رموز (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) ، رسالہ مخزن اسرار (۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء) ، وغیرہ کا بطور مجموعی جائزہ لیا جائے گا ۔

" صنعت معما اس مخصوص کلام کو کہتے ہیں جس سے بہ اشارۂ لفظی یا بہ دلالت حرفی وغیرہ کوئی نام یا عبارت حاصل ہو ۔ وہ کلام شعری پیکر میں ہوتا ہے اور شاذ و نادر نثری پیکر میں اس سے اکثر کوئی نام حاصل ہوتا ہے ...."[1]

---

۱ ۔ امام بخش صہبائی ، ص ۱۳۳

صنعت معما ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ، ایک مشکل صنعت ہے اور اس کے لئے خاصی فہم و فراست اور علمیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگرچہ صہبائی کے زمانے میں اس کا رواج کم ہوگیا تھا لیکن چونکہ صہبائی نے ذہن رسا اور دشوار پسند طبعیت پائی تھی اور ان کا میلان طبع مشکل گوئی کی طرف تھا اس لئے انھوں نے اس صنعت کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش کی ۔ معما کے بارے میں خود صہبائی مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں ــــ

" .... معما کلامیست موزون کہ دلالت کند بر اسمی از اسما بطریق رمز و ایما دلالتی کہ پسندیدۂ طبعہای سلیم باشد و انچہ در قید کلام و وزن و اسم و جریان اعمال معما در غیر انہا و دلالتش بر جزو آن ست ... "[1]

صہبائی نے ابتدا میں فن معما کے مشہور استاد نصیرائے ہمدانی اور جامی کے معموں کی شرحیں لکھی تھیں یعنی شرح معمائے نصیرائے ہمدانی (۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء) اور شرح معمائے منظوم جامی (۱۲۵۱ھ / ۳۶-۱۸۳۵ء) جن کا ذکر اگلے باب میں شرح نویسی کے ذیل میں آئے گا ۔

معما نویسی کا آغاز غالباً اواخر دور تیموری یعنی جامی کے دور سے ہوتا ہے کیونکہ اس سے قبل کسی مشہور شاعر کا نام اس صنعت کے سلسلے میں ہم کو نظر نہیں آتا ۔ اس کے بعد ایران میں دور صفویہ اور ہندوستان میں دور مغلیہ میں منظوم معما گوئی کا رواج برقرار رہا ۔ اگرچہ اس کو کبھی وہ فروغ حاصل نہ ہوسکا جو فارسی ادب میں دوسرے فنون اور موضوعات کو حاصل ہوا ۔ اس کا سبب دراصل اس فن کی دقت اور پیچیدگی تھی ۔ فن معما گوئی ایک مشکل اور دشوار موضوع تھا

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، ص

جس پر لکھنے کی ہمت کوئی عام شخص نہیں کرسکتا تھا ۔ غالباً فن معما گوئی اس دور کی طرز نگارش، جو مشکل پسندی ، دقت خیال و معنی پر مبنی تھی ، کی دین ہے ۔

اکبر کے دور میں فیضی نے بھی اس میں طبع آزمائی کی تھی اگرچہ بعد میں اسے ترک کردیا تھا ۔ قاسم کاہی بھی کبھی کبھی معما کہا کرتا تھا ، "اسم اللہ" پر اس کا معما موجود ہے ۔ جعفر ہروی اور میر حیدر رفیعی کاشی جن کے نام کا جزہی معمائی تھا فن معما میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔[1]

رسالہ نادرہ ۔

رسالۂ نادرہ کی ابتدا میں صہبائی کے چند اشعار ہیں جن میں خدا تعالی کی حمد بیان کی گئی ہے ۔

"الٰہی سرنامہا نام تست
نعیم دو عالم ز انعام تست
ہمہ اصل پنہان و پیدا توئی
کشایندۂ ہر معما توئے
خدایا بحق نبی و ولی
ز رحمت بہ بخشای کوکبیؔ"[2]

رسالۂ نادرہ میں موضوع بحث ملا کوکبی کا مندرجہ ذیل شعر ہے ۔

کشت امید حاصل ازان ماہ پر عتاب
نیمی ز آب سرکش و نیمی نیافت آب

---

۱ ۔ بزم تیموریہ ، جلد اول ، ص ۵۸۰
۲ ۔ کلیات صہبائی ، جلد اول ، ص ۶۱۴

کوکبی نے اس شعر سے ۳۷ مختلف نامون کا استخراج کیا ہے۔ صہبائی نے اپنے اس رسالے مین بتایا ہے کہ اعمال معمائی سے یہ ۳۷ نام کیونکر حاصل ہوئے ہین۔ صہبائی نے اس رسالے کی تاریخ اختتام ع "از روی غرابت آمدش نادرہ نام" سے نکالی ہے۔ "روی غرابت" یعنی ع (۱۰۰۰) کو اگر (نادرہ) (۲۶۰) کے ساتھ شامل کیا جائے تو سنہ ۱۲۶۰ھ کے اعداد (مطابق ۱۸۴۴ء) برآمد ہوتے ہین۔ یہ عمل بھی اعمال معمائی مین سے ہے۔[1]

گنجینۂ رموز

ان کا دوسرا رسالہ فن معما پر "گنجینۂ رموز" ہے جو ۱۳۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور کلیات صہبائی (جلد اول) مین شامل ہے۔ یہ رسالہ علحدہ سے بھی ایک بار ۱۸۸۷ء مین لکھنئو مین طبع ہوا تھا۔[2] اس رسالے مین انھون نے ایک بیت کے الفاظ سے ۳۵۰ نام استخراج کئے ہین۔ وہ بیت یہ ہے ــــ

جو آن مہ روی خود از پردہ بنمود

دل از ما برد و آخر کرد نابود

رسالے کی ابتدا حسب سابق خدا تعالی کی حمد سے کرتے ہین۔

بنام آنکہ بر علمش ہویدا ست

اگرچہ راز دل مشکل معما ست

نخواہم جز تو در خواہم رسولت

کہ آمین خواندہ بر حرفش قبولت

اس کے بعد دیباچے مین اس رسالے کی تالیف کا سبب یہ بیان کرتے ہین کہ جب میرے دل مین فن معما کی تحصیل کی خواہش پیدا ہوئی تو مین نے اس فن کے

۱۔ امام بخش صہبائی، ص ۱۳۳، ۱۳۴

۲۔ ایضاً ص ۱۳۵

علماے متقدمین میں سے شرف الدین علی یزدی ، مولانا جامی اور میر حسین نیشاپوری کے کلام کا مطالعہ کیا ۔ ان کے پسندیدہ اسلوب نے مجھ کو بے حد متاثر کیا چنانچہ پہلے تو میں نے مولانا جامی کے رسالے " معماے منظوم " کی شرح لکھی اور اس کے بعد ان کے کلام کی پیروی میں ڈیڑھ سو سے زیادہ معمائی رباعیان کہیں جن سے خدا کے ننانوے نام نکلتے ہیں[1] ، لیکن کلیات میں جو رسالہ جواہر منظوم کے نام سے شامل ہے اس میں ڈیڑھ سو نہیں بلکہ ایک سو تیس رباعیان شامل ہیں ۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس درمیان لوگوں نے مجھ کو ملا کوکبی کی اس بیت کی طرف متوجہ کیا جس سے اس نے اعمال معمائی کے ذریعے تیس سے زیادہ نام استخراج کئے ہیں جس کو دیکھ کر عقل حیران رہ گئی اور اللہ تعالی کے خزانے سے میری فہم و ادراک میں وہ چیز آئی کہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ۔ اس بات کو اپنی مخصوص طرز نگارش میں یوں کہتے ہیں ــــ

" .... نقب خیال صہبائی از گنج خانۂ عالم قدس سربرآورد و ازین عالم نقدی در دامن اندیشہ سپرد چون چشم تامل بر کشادم گوہری یافتم کہ حامل دو کون ہزار یک بہای آن نیرزد ...."[2]

یعنی انہوں نے مندرجہ ذیل بیت کہی جس کے الفاظ سے ۳۵۰ نام استخراج کئے جاسکتے ہیں

چو آن مہ روی خود از پردہ بنمود
دل از ما برد و آخر کرد نابود

"گنجینۂ رموز " اسم بامسمی ہے یعنی اس رسالے میں صہبائی نے اعمال معمائی بڑی " شرح و بست" سے بیان کئے ہیں ۔ اعمال معمائی کو سمجھانے کی غرض سے ہر بار

۱۔ کلیات صہبائی ، ص ۳۹۸
۲۔ کلیات صہبائی ، ص ۳۹۹

ایک نیا نام شعر سے نکال کر اس کی مثال مین تحریر کیا ہے۔ اس رسالے کو فن معما مین ان کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

مخزن اسرار۔

ایک اور رسالہ " مخزن اسرار " فن معما مین صہبائی کی تصنیفات مین شامل ہے۔ یہ ٥٤ صفحات پر مشتمل ، اور کلیات صہبائی جلد اول مین موجود ہے۔ یہ رسالہ ١٨٨٥ء مین لکھنئو سے بھی علحدہ سے شایع ہوا تھا۔[1]

اس رسالے کی تالیف کا سبب یہ تھا کہ ملا کوکبی کی مندرجہ ذیل بیت جس سے انھون نے خود اعمال معمائی کے ذریعے ٣٧ نام برآمد کئے تھے۔

کشت امید حاصل ازان ماہ پر عتاب

نیمی ز آب سرکش و نیمی نیافت آب

اس بیت کو طلبا صہبائی سے پڑھتے تھے اور صہبائی اس کی تشریح کرکے ان کو سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس درس و تدریس کے دوران جب بھی وہ اس کی تشریح کی غرض سے گہرائی مین جاتے تو ان کی فکر عمیق اس مین سے کسی نئے نام کا گوہر چن لیتی یعنی ہر بار وہ اس سے کوئی نیا نام برآمد کرلیتے۔ زیادہ غور و فکر کرنے پر انھون نے اس بیت کو ایک بحر بیکران پایا جس مین بیشتر گوہر گوہر آبدار چھپے ہوئے تھے۔ چنانچہ انھون نے اس بیت سے اپنی فکرد قیقہ رس کے ذریعے ڈیڑھ سو کے قریب مزید نام استخراج کئے جس کو انھون نے الگ ایک رسالے مین مع اس کے اعمال معمائی کے مطابق اور ان کے استخراج درج کردئے اور اس کا نام " مخزن اسرار" رکھ دیا۔

اس رسالے کو بھی وہ حسب معمول خدا تعالی کی حمد مین کہے گئے اشعار سے

١۔ امام بخش صہبائی ، ص ١٣٦

شروع کرتے ہین جو بہت روان اور پر اثر ہین ۔

خامۂ سخن تا بمیان آورد

نام تو اول بزبان آورد

ذکر تو سرمایۂ آرام جان

حرف ثنایت شکر کام جان ۔[۱]

اس کے بعد اس رسالے کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے حافظ کا ایک شعر لکھتے ہین جس سے ان کو اس کام کا حوصلہ ملا ۔

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید

دیگران هم بکنند انچه مسیحا میکرد

نتائج الافکار ۔

چونکہ صہبائی کا علم و فضل ان کو تھوڑی مدت بھی بیکار نہ رہنے دیتا تھا ۔ وہ ایک کام ختم کرتے تو دوسرا شروع کر دیتے تھے ۔ اگر وہ ذرا بھی تساہلی اختیار کرتے تو ان کے دوست بالخصوص سرسید ان کو کسی نہ کسی نگارش علمی و تحقیقی کے لئے آمادہ کرتے ۔

ایک بار جب انھین کچھ فرصت میسر آئی تو انھون نے تصنیف و تالیف کے کام کے لئے کسی موضوع کا انتخاب کرنا چاھا ۔ کیونکہ ان کا رجحان اور دلچسپی صنعت معما ، فن عروض اور کتب متداولہ کی شرحین لکھنے کی طرف زیادہ تھا اس لئے ابتدا مین انھون نے ان مین سے کسی موضوع کا انتخاب کرنا چاھا لیکن پھر سوچا کہ کیون نہ ان اشعار مشکلہ کی تشریح کی جائے جو اس زمانے کی ادبی محفلون مین موضوع بحث رہا کرتے تھے اور جن کے مطالب پر اکثر اختلاف رائے رہتا تھا ۔ چنانچہ

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، جلد اول ، ص ۵۶۱

انھون نے ایسے ھی چند مشکل اشعار کا انتخاب کیا اور ان کی تشریح کی ۔ چونکہ ان اشعار کی تشریح خود ان کے اپنے افکار کا نتیجہ تھی اس لئے انھون نے اس رسالے کا نام " نتائج الافکار " رکھا اور اس رسالے کو دو فصلون مین تقسیم کیا ۔

پہلی فصل مین انھون نے کچھ اپنے اور کچھ دیگر اساتذہ کے معمون کے حل پیش کئے اور اعمال معمائی سے ان کی تشریح کی ۔

دوسری فصل مین بعض مشہور اساتذہ کلام کے مشہور اور مشکل اشعار کی تشریح کی ھے جیسے انوری ، خاقانی ، نظامی ، سعدی ، حافظ و خسرو ، بدر چاچ و جلال اسیر ، عرفی ، نظیری اور زلالی وغیرہ ۔ ان مین کچھ ایسے اشعار بھی شامل ھین جو اپنے مشکل اور مبہم مطالب کی وجہ سے مشہور تو بہت ھین لیکن شاعر کے نام معلوم نہین ۔ یہ رسالہ ٤٤ صفحات پر پھیلا ھوا ھے اور کلیات صہبائی مین شامل ھے ۔

اس رسالے کی ابتدا مین صہبائی نے ھندوستان کے فارسی دانون کی کم مائیگی اور بے راہ روی کی مزمت کی ھے کہ وہ اپنی قابلیت اور علمیت کے جوش اور غرور مین اساتذۂ زبان کو خاطر مین نہین لاتے جنانچہ کہتے ھین ۔

" نمی دانند کہ باین دستگاھی با صاحب دستگاھان طرف نتوان شد و باین بیراھہ روی با راہ رولن حریف نتوان گشت عجب ھنگامہ ایست کہ می آرایند و طرفہ و کافیست کہ می کشایند لاف یکہ تازی بآن مرتبہ و راہ این ھمہ پیچ در پیچ و دعوی علم بآن درجہ و معلوم ھیچ ھندی نژاد را بر ایرانی زبان دست یافتن بی آنکہ چندی باموبدان آن آتشکدہ دست بیعت ندھد یا بر زمزمۂ ژند خوانان آن دبستان گوش نہ نہد صورت نہ بندد ...."[1]

---

۱ ۔ کلیات صہبائی جلد اول ، ص ٦٤٤

دراصل مندرجہ بالا تحریر سے ان کا اشارہ اس زمانے کی ایک ادبی بحث کی طرف ہے جو ان کے دور سے ایک صدی قبل اہل علم کا موضوع سخن رہی تھی اور جس کے اثرات صہبائی کے عہد تک باقی تھے۔ صہبائی کے زمانے میں بھی اکثر ادبی محفلوں میں اس موضوع پر بحث و مباحثے ہوتے تھے اور لوگ اپنی اپنی رائے پیش کرتے تھے۔ ایک صدی قبل سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے ایک رسالے "تنبیہ الغافلین" میں اس وقت کے زبان فارسی کے مشہور استاد شیخ علی حزیں کی شاعری پر اعتراضات کئے تھے۔ شیخ علی حزین نے اگرچہ اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی اس وقت کے اہل علم و فضل کے درمیان ایک ادبی بحث کا آغاز ہوگیا تھا جس نے ادبی معرکہ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلتا رہا۔ (اس ادبی معرکے کا تفصیلی ذکر صہبائی کے رسالہ قول فیصل کے تحت کیا جائے گا)۔

صہبائی نے بھی اس ادبی معرکے میں "قول فیصل" لکھ کر ان اعتراضات کے جواب دئے تھے۔ صہبائی، جیسا کہ مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہے، اس نظریے کے ماننے والے تھے کہ ہندوستان کے فارسی دان حضرات ایرانی النسل فارسی دان حضرات کی برابری نہیں کرسکتے ان کا خیال تھا کہ ایک ہندوستانی فارسی دان اس وقت تک فارسی میں مہارت حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ آتشکدۂ فارسی کے موبدوں کی شاگردی اختیار نہ کرے یا اس دبستان کے ژند خوانوں کے زمزمے پر کان نہ لگائے

اس قسم کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی ایک ایرانی النسل فارسی دان کے برابر نہ سمجھتے تھے۔ یہ امر ان کی طبیعت کی انکساری پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت کے فارسی کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے لیکن ان کی طبیعت کی منکسرالمزاجی ان کو اس قسم کے الفاظ کہنے پر مجبور کردیتی تھی۔

اب ذیل مین مثال کے طور پر چند اشعار (جو نتائج الافکار سے لئے گئے ہین)
اور ان کی تشریح دی جا رہی ہے ۔

مثال کے طور پر حافظ کے شعر ۔

نگویمت که همه سال می پرستی کن

سه ماه می خور و نه ماه پارسا می باش

کی تشریح کرتے ہوئے صہبائی کہتے ہین مین یہ نہین کہتا کہ پورے سال شراب کا لطف اٹھاؤ اور کبھی اطاعت اور عبادت مت کرو بلکہ تین مہینے شراب پیو اور باقی نو مہینے پارسا رہو اور عبادت کرو ۔ چونکہ شراب نوشی کا اصل لطف بہار کے تین مہینون مین ہی آتا ہے اس لئے صرف سال کے تین مہینے شراب کا لطف اٹھانا اور سال کے زیادہ مہینون مین یعنی نو مہینے تک خوب عبادت کرنا اور پارسا بن جانا چاہئے ۔ حافظ کے اس شعر کے معنی اکثر لوگ تصوف کے اعتبار سے نکالتے ہین اور تین مہینے اور نو مہینے سے دوسرے معنی مراد لیتے ہین ۔ یہ ان کے مذاق اور کم فہمی کا نتیجہ ہے ۔ صہبائی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس کو تصوف کے معنی نہین پہناتے اور نہ ہی اس کے وہ معنی مراد لیتے ہین جو حافظ کے اکثر عقیدت مند سمجھتے ہین ۔ صہبائی کی تشریح ان کے ذوق سلیم پر دلالت کرتی ہے ۔
ایک اور شعر کی تشریح کرتے ہوئے صہبائی کہتے ہین ۔

بتوان ز کرم بندهٔ خود کرد جهان را

زینجا ست که هر کس که کریم ست بخیل ست

یہ ایک مشہور اور مشکل شعر ہے جو زبان زد خاص و عام ہے ۔ اور لوگ ایک دوسرے سے مطلب پوچھتے ہین ۔ اس کے علاوہ طلبا سے ان کی ذہانت کے امتحان کی غرض سے

اس کے علاوہ طلبا سے ان کی ذہانت کا امتحان لینے کی غرض سے پوچھا جاتا ہے۔ بہرحال شاعر کہتا ہے کہ دنیا کو اپنے کرم سے بندہ بنا لینا ممکن ہے کیونکہ مہربانی و کرم سے کسی بھی شخص کو بندہ یا غلام بنایا جاسکتا ہے۔ جس طرح احسان کے بوجھ سے ایک غلام گردن جھکا دیتا ہے وہ بھی احسان کے بوجھ سے جھک جاتا ہے۔ یہی امر ظاہر کرتا ہے کہ کریم بخیل ہوتا ہے کیونکہ غلام کی املاک مالک کی املاک ہوجاتی ہے پس کرم کرنے سے وہ شخص انتہائی احسان مندی کے طور پر اس کا غلام بن جاتا ہے اور چونکہ غلام کا سارا مال و زر کرم کرنے والے کا ہوجاتا ہے اس لئے اب اس کے سامنے سے وہ نہیں لے جاسکتا اور یہی حال ایک بخیل کا ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال و زر اپنے سامنے سے ہٹنے دینا نہیں چاہتا [1]

رسالہ غواص سخن۔

یہ رسالہ کلیات صہبائی میں بیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کو کلیات کے مولف میر منشی دین دیال نے ترتیب دیا تھا۔ اس رسالے کی ابتدا میں منشی دین دیال کہتے ہیں کہ جس زمانے میں میں مولانا امام بخش صہبائی سے مختلف اساتذہ کے دواوین اور منشآت سے درس لیا کرتا تھا اور ان کی مجلس درس تدریس میں موجود رہتا تھا اکثر دیکھتا تھا کہ دوران تدریس ان کا " قلم بلاغت رقم " فارسی کے کچھ نکات لکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ ایک بار میرے استفسار پر فرمایا کہ اساتذہ کے نتائج طبع سے نکات سخن جمع کرتا ہوں اور لفظ و معنی کے جواہر جو ان اکابر کے معدن فیض سے نکلے ہیں، ان کو لکھتا ہوں تاکہ متقدمین کے کلام کی وسعت اور متاخرین کے کمال فن کی نشاندہی کرسکوں۔ چونکہ فلک کج رفتار

۱۔ کلیات صہبائی جلد اول، ص ۶۵۲

نے مجھ کو ان کی خدمت سے محروم کر دیا اور پھر وہ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے ۔ بڑی کاوش اور جستجو کے بعد بھی میں ان کی تحریر کو تلاش نہ کر سکا ۔ کچھ مدت بعد محمد حسین ہجر (ناظم عدالت اندور) جو صہبائی کے شاگردوں میں تھے ان کے پاس سے یہ مسودہ مجھ کو حاصل ہوا ۔

ایسے ہی نکات سخن کو کلیات مرتب کرتے وقت مولف یعنی میر منشی دین دیال نے کلیات میں شامل کر دیا اور اس کا نام "غواص سخن" رکھ دیا ۔ اس رسالے کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے اگرچہ یہ بیاسی صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن پھر بھی موضوع کے اعتبار سے اس کی ضخامت کم معلوم ہوتی ہے ۔ اگر صہبائی کی زندگی کچھ اور مہلت دیتی تو یہ کام کچھ اور زیادہ ضخیم ہوتا ۔

ہر زبان میں وقت کے ساتھ غیر محسوس طریقے پر تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے ۔ یہ تبدیلی لفظوں محاوروں اور ترکیبوں کی تبدیلی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے ۔ فارسی زبان میں اسی قسم کی کچھ تبدیلیوں کو صہبائی نے دوران مطالعہ محسوس کیا تھا جن کو انھوں نے یکجا کرنے کی کوشش بھی کی تھی ۔ ساتھ ہی اساتذہ کے اشعار کے حوالوں سے ان کا محل استعمال بھی بتایا ہے ۔ مثال کے طور پر "ابر" "ہوا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور "ہوا" ابر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فردوسی کا شعر ہے ۔

فرود آمد از ابر سیمرغ و چنگ

برو بر گرفتش ازان گرم سنگ

یا آتشگہ بہ معنی آتشکدہ بھی آتا ہے جیسے نظامی کا شعر ہے ۔

چنان بود رسم اندران روزگار

کہ باشد در آتشگہ آموزگار

یا "امشب" جس کا اطلاق شب گذشتہ پر بھی ہوتا ہے چنانچہ امیر خسرو کہتے ہیں ۔

تو شبانہ می نیائی ببر کہ بودی امشب

کہ ہنوز خفتہ بودی [illegible]

یا لفظ " پیچد " برگشته ہونے کے معنی میں بھی استعمل استعمال ہوتا ہے جیسے

که فرزند هر چند پیچد ز دین

بسوزد بمرگش پدر همچنین

الفاظ ، محاورون اور ترکیبون کی اس طرح کی تبدیلیون اور نکتون کو صہبائی نے محسوس کیا تھا اور ایک جگہ جمع کرلیا تھا ۔ یہ امر ان کی دقیقہ سنجی اور تعمق فکر کا بین ثبوت ہے ۔

اس رسالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان و ادب کا مطالعہ انھون نے بڑی گہرائی سے کیا تھا اور یہ کہ وقت تحریر وہ تحقیق کا خاص خیال رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اپنی بات کی تائید کے لئے وہ متقدمین و متاخرین شعرا کے کلام سے شواهد و امثال بھی پیش کرتے تھے مثلاً " تن زدن " (خاموش شدن) محاورے کا استعمال متقدمین اور متاخرین دونون کے یہان بہت ملتا ہے ۔ اس کے لئے وہ چند اشعار سے مثالین پیش کرتے ہین ۔

عرفی کا شعر ہے ۔

تن زنم وین نغمه را در نیم شب

همره مرغ سحر خوان مزنم

ایک اور جگہ نظامی گنجوی اپنے شعر مین اس محاورے کا استعمال کرتے ہین ۔

چو گردن کشد خصم گردن زنم

چو از دشمنے تن زند تن زنم

مولوی معنوی اس محاورے کا استعمال کرتے ہین ۔

حریف جنگ گزیند تو هم در آور جنگ

چو سنگ صداع دهد تن مزن بر آور سنگ [1]

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، ص ۶۹۰

رسالہ اعلاء الحق

اعلاء الحق کلیات صہبائی کی پہلی جلد مین آخری رسالہ ہے جو سراج الدین علی خان آرزو کے رسالے احقاق الحق کے جواب مین لکھا گیا ہے۔ احقاق الحق مین شیخ علی حزین کے گیارہ اشعار پر اعتراض کیا گیا ہے جس کا جواب صہبائی نے اپنے رسالے اعلاء الحق مین دیا ہے۔ اعلاء الحق صرف چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔ صہبائی کے اس رسالے مین احقاق الحق کے مصنف کا نام کہین نہین آیا ہے بلکہ صہبائی نے مصنف کے لئے صاحب احقاق الحق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ البتہ مولف کلیات نے فہرست رسائل کے تحت اعلاء الحق کے بارے مین یہ الفاظ لکھے ہین ـــــ

" رفع اعتراضات است کہ سراج الدین علی خان آرزو در رسالۂ احقاق الحق بر علی حزین کردہ بود "۔

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہین کہ صاحب احقاق الحق سے مراد سراج الدین علی خان آرزو تھے۔

ابتدا مین تقریبا" چار صفحون کی تمہید ہے جس مین چند سطرین شیخ علی حزین کی تعریف مین ہین پھر ایک مثنوی ہے جس مین پندرہ اشعار ہین ذیل مین اس مین سے چند اشعار درج کیے جارہے ہین۔

ز فیض آن بہار طبع رنگین
ورق خواہد شدن دامان گلچین
اگر حفظ کلامش را کند پاس
رگ گل می نماید تار انفاس
ز لفظ و معنیش کان جملہ نور ست
زبان خامہ شاخ نخل طور ست [1]

1۔ کلیات صہبائی، جلد اول ص ۷۵۹

پھر اس کے بعد وہ گیارہ اشعار ، جن پر آرزو نے اعتراضات کئے تھے ، لکھے ہیں ۔ ساتھ ہی ان اعتراضات کے جواب بھی لکھتے ہیں ۔ ذیل میں دو اشعار ان کے اعتراضات اور ان کے جوابات مثال کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں ۔

حزین کا شعر ہے ——

درین فکرم کہ تعلیم جبین سازم سجود ترا

بداغ دل دہم یا داغدار مشق سودش را

حزین کے اس شعر پر آرزو کا اعتراض ہے کہ رخسار کو مشک سود کہنا غلط ہے ۔ صہبائی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رخسار کو مشک سود کہنا بالکل صحیح ہے ۔ اور سند میں اساتذہ کا کلام پیش کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ بابا فغانی ، جو کہ اہل زبان ہیں اور ان کا قول ہندی نژاد فارسی دانوں کے مقابلے میں زیادہ مستند ہے وہ بھی رخسار کو مشک سے تشبیہ دیتے ہیں ۔

اے خطت ریحان و خالت لالۂ و رخسار مشک

نرگست آہوی چین و غمزۂ خوانخوار مشک

چونکہ ایران میں ابتدا میں ترک حسین لڑکے معشوق ہوا کرتے تھے اس لحاظ سے ان کی تعریف میں خط اور اس کی مناسبت سے مشک جیسے الفاظ شعر میں استعمال کئے جاتے تھے اور چونکہ اس کا استعمال اہل زبان کے یہاں ملتا ہے اس لئے رخسار کو مشک سے تشبیہ دینا غلط نہیں معلوم ہوتا ۔ حزین کا ایک اور شعر ہے ——

در ساغر ہشیاران این نشۂ نمی گنجد

حیرت زدگان دانند آن عارض زیبا را

اس شعر پر آرزو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نشہ شراب میں ہوتا ہے ساغر میں نہیں ۔

اس کے جواب مین صہبائی کہتے ہین کہ یہ صحیح ہے کہ نشہ شراب مین ہوتا ہے ساغر مین نہین لیکن چونکہ شراب ساغر مین رہتی ہے اس لئے مجازاً " کہہ سکتے ہین کہ نشہ ساغر مین ہے ۔ مرزا صائب اصفہانی جو اہل زبان تھے ان کے شعر سے سند دیتے ہین ۔

ساقی ما در مروت ہیچ خود رائی نکرد

نشۂ انجام را در ساغر آغاز کرد

رسالہ مناقشات سخن ۔

صہبائی کا ایک اور رسالہ مناقشات سخن بھی ہے جو تئیس صفحات پر مشتمل اور کلیات صہبائی جلد ثانی (حصہ دوم) مین شامل ہے ۔ اس مختصر رسالے مین صہبائی نے اپنے ایک ہم عصر مولوی امام علی مقتول[1] کی ایک انشاء کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی تحریر مین لفظی ، نحوی اور معنوی اعتبار سے کتنی غلطیان ہین ۔ امام علی مقتول نے ایک مکتوب مین مکتوب الیہ کو اپنا ایک خواب اور اس کی تعبیر بیان کی تھی ۔ ان کو اپنی اس تحریر پر بڑا ناز تھا صہبائی اپنے اس مختصر رسالے کا آغاز مندرجہ ذیل دو شعر سے کرتے ہین ۔

" تا چند سخن ز گلعذاران گویم

تا چند حدیث دلفگاران گویم

اکنون زمناقشات ارباب سخن

خواہم سخنی چند بیماران گویم

درینوقت عبارتی بنظر در آمد کہ لفظ لفظش چون جوز بازیچۂ کودکان پوچ و سطر سطرش چون لونی نژادان شب نشین پا در ہوا معانی خسیہ در تراکیب ستش چون انبوہ مگس در سبکۂ تار عنکبوت و خیالات رکیکہ در الفاظ بیربطش چون خبط در دماغ صاحب

---

۱ ۔ مولوی امام علی مقتول کا ذکر کسی تذکرے مین نہین ملتا ۔

مالیخولیا حسن عبارت از تشبیه و استعاره چون تقطیع بے مایگان از زیور عاریت در نظر اهل تحقیق خوار و جلوه معنیش در کسوت مجاز و کنایه چون صورت مشعبدان در دیدهٔ صاحب نظران بے اعتبار بندار مصنفش اینکه کلند اندیشهٔ معنی شناسان عرصه بر نقب مغلقاتش نتواند رسد "[1]

رساله قول فیصل ـ

رساله قول فیصل ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ، کلیات صہبائی جلد ثانی (حصه دوم) مین شامل هے ـ اس کے علاوه لکھنئو سے بھی ۱۸۸۰ء مین شایع هوا تھا ـ

اس رسالے مین ایک ادبی مناقشه جو فارسی کے دو عظیم المرتبت استادون یعنی سراج الدین علی خان آرزو اور شیخ محمد علی حزین اصفهانی کے درمیان هوا تھا ، اس پر محاکمه کیا گیا هے ـ چونکه اس وقت فارسی زبان و ادب کا رواج اور ذوق عام تھا اور سرکاری نیز ادبی کام فارسی مین هی انجام دئے جاتے تھے اس لئے اس ادبی بحث سے بھی لوگون کو دلچسپی پیدا هوگئی تھی ـ یه سلسله قریب سو سال تک چلتا رها یہان تک که صہبائی کے دور مین بھی یه سلسله باقی تھا چنانچه صہبائی نے بھی اس مناقشه پر اپنے ایک رسالے " قول فیصل" مین اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ـ

سراج الدین علی خان آرزو (۱۶۸۷ء / ۱۰۹۹ھ ـــ ۱۷۵۵ء / ۱۱۶۹ھ) کی شخصیت اپنے عہد کے شعرا مین سب سے ممتاز تھی اور ان کا مقام فارسی شعر و ادب مین انتہائی بلند اور نمایان تھا یہی وجه هے که ان کے اکثر معاصرین ان کو "سراج الشعرا" اور "سراج المحقیقین" کے القاب سے پکارتے تھے ـ متعدد تصانیف ان کی یادگار هین ـ ان کے شاگرد بھی بکثرت تھے جن مین سب سے نمایان نام میر تقی میر

---

۱ ـ کلیات صہبائی ، جلد دوم ، ص ۳۲

کا ہے ۔ چونکہ معاصرین مین ان کی علمی شخصیت اور مرتبہ بہت بلند تھا اس بات نے ان کی طبعیت مین تکبر اور غرور پیدا کر دیا تھا جیسا کہ آزاد لکھتے ہین ۔

"... ان کے کلام کو سب اہل تحقیق مسلم اور مستند جانتے ہین ....
انہین خود بھی اپنے باب مین بڑے بڑے دعوے تھے چنانچہ کتاب مثمر کے دیباچے مین چند شعرائے فارس اور ہند کے نام لکھ کر کہتے ہین کہ
" درین ولا کہ ہندوستان خالی از اہل کمال است ناموس سخنوری را بزور در گردن ہیچمدان بستہ اند " انہین خیالات نے برانگیختہ کیا کہ شیخ علی حزین کے دیوان پر " تنبیہ الغافلین لکھی اور سمجھ لیا کہ ہم نے اس کے دیوان کو رد کر دیا ...."[1]

شیخ محمد علی حزین (۱۶۹۲ء / ۱۱۰۳ھ ۔ ۱۷۶۶ء / ۱۱۸۰ھ) اصفہان مین پیدا ہوئے تھے لیکن دوسرے ایرانی شعرا کی طرح وہ بھی ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان چلے آئے تھے جیسا کہ ان سے قبل بھی بہت سے ایرانی شعرا مغلیہ شہنشاہون کی ادب نوازی اور قدر دانی کا شہرہ سن کر ہندوستان چلے آئے تھے شیخ علی حزین ایران سے آنے والے شعرا مین غالباً " آخری شاعر تھے جن کو مغل دربار کے ادبی ماحول اور ان کی قدردانیون نے ہندوستان آنے پر مجبور کر دیا ۔ شیخ علی حزین کی تصانیف مین چار دیوان اور کئی رسالے فقہ ، منطق ، تصوف اور علم طب پر ہین ۔ آزاد ان کو " آبروئے متقدمین و فخر متاخرین " جیسے القاب سے یاد کرتے ہین ۔

اس مین شک نہین کہ فارسی ان کی مادری زبان تھی اور یہ کہ اہل زبان ہونے کی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے فارسی زبان و ادب کے ماہر اور مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے ۔ چونکہ اس وقت دہلی شہر مین فارسی زبان و ادب کا چرچا عام تھا

---

۱ ۔ نگارستان فارس ، ص ۲۱۸

اور اس وقت تک فارسی زبان کو علمی و ادبی حیثیت حاصل تھی اس لئے دھلی کے لوگون نے انھین ھاتھون ھاتھ لیا ۔ اھل زبان ھونے کی وجہ سے وہ ھندوستان کے فارسی زبان دانون اور ان کی شاعری کو خاطر مین نہین لاتے تھے ۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے ایرانی النسل ھونے پر بھی غرور اور تکبر تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر اشعار مین اھل ھند کی تحقیر و تذلیل بھی کرجاتے تھے ان کا مندرجہ ذیل شعر اس بات کا ثبوت ھے ۔

نسناس سیرتی ست تمنای مردمی

در دیولاخ ھند کہ انسان نداشتہ است

اکثر وہ ھندوستانی شعرا کے کلام مین اصلاح بھی دیا کرتے تھے جیسا کہ محمد حسین آزاد لکھتے ھین کہ ایک بار کسی شخص نے آرزو کے مندرجہ ذیل اشعار شیخ حزین کے سامنے پڑھے ۔

عشق روز کہ بدل خلعت سودا بخشید

جامہ داری بمن از دامن صحرا بخشید

خجل از روی حبابم کہ باین تنگی ظرف

انچہ در کیسۂ خود داشت بدریا بخشید

شیخ حزین نے دوسرے شعر مین یون اصلاح کی ۔

خجل از چشم حبابم کہ بیک ظرف تنک

انچہ در کاسۂ خود داشت بدریا بخشید

اور کہا کہ یہ شخص " کیسہ " اور " کاسہ " اور " تنکی " اور " تنگی " مین فرق نہین کرسکتا اور اپنے آپ کو شاعر کہتا ھے ۔ خان آرزو کو بھی لوگون نے اس بارے مین اطلاع کردی ۔[1]

---

۱ ۔ نگارستان فارسی ، ص ۲۱۲

چنانچہ اس کے کچھ مدت کے بعد خان آرزو نے " تنبیہ الغافلین " نامی کتاب لکھی جس مین شیخ حزین کے تین سو سے زاید اشعار پر اعتراضات کئے اور ان مین سے بعض کو ابتذال پر مبنی قرار دیا ۔ چونکہ شیخ حزین کا رویہ ہندوستان کے لئے تحقیر آمیز تھا اس لئے لوگون کے دلون مین ان کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہوگئے تھے ۔ علاوہ ازین انھون نے اس وقت کے مستند اور مسلم استاد خان آرزو کے کلام پر اعتراضات کئے تھے اور ان کی اصلاح کرکے ان کی بے عزتی کی تھی اس وجہ سے خان آرزو اور ان کے ساتھی شیخ حزین کے خلاف ہوگئے ۔ اور انتقامی جذبے کے تحت ان کے کلام مین عیب جوئی کرنے لگے اور اس قسم کے اعتراضات کو جمع کرکے " تنبیہ الغافلین " کے نام سے ایک کتاب تصنیف کرڈالی ۔

آرزو اور حزین کے تنازعے کے بارے مین جمیل جالبی مندرجہ ذیل الفاظ مین اظہار خیال کرتے ہین ۔۔

" ۰۰۰۰ ایرانی ہمیشہ ہندوستان کی فارسی پر اعتراض کرتے رہے ۔ مغلون کے زمانے مین ایرانی اہل علم کی بڑی تعداد کے یہان آنے پر اس رویے مین اور شدت پیدا ہوئی ۔ اکبری دور مین عرفی اور فیضی کا تنازعہ مشہور ہے ۔ یہ اعتراضات اس وقت تک تو اٹھتے اور دبتے رہے جب تک مغلیہ سلطنت اپنی مرکزیت کے ساتھ قائم تھی ۔ لیکن زوال سلطنت کے ساتھ ہی جب فارسی کو زوال ہوا اور ایرانی احساس برتری مین اب بھی اسی قسم کے اعتراضات کرتے رہے تو پھر یہ جنگ دو بدو ہونے لگی ۔ یہ مادہ اس وقت پھٹا جب شیخ محمد علی حزین (۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء ۔۔ ۱۱۴۷ھ / ۱۷۳۴ء) وارد دہلی ہوئے ۔

حزین نے ۱۷۴۱ء میں تذکرۂ الاحوال لکھا جسکے بارے میں حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ "گویا رسالہ لکھنے کی غرض و غایت ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مذمت ہے" ۔ حزین تنک مزاج و متکبر انسان تھے ۔ انھوں نے جب ہندوستانیوں کی فارسی پر اعتراض کیا تو لوگوں نے سند میں سراج الدین علی خان آرزو کو پیش کیا ۔ حزین نے جواباً "آرزو کی فارسی و فارسی دانی پر بھی اعتراض کیا اور اسی زمانے میں انھوں نے ہند اور اہل ہند کی ہجویں بھی لکھیں ۔ آرزو جو اس دور کے مسلم الثبوت استاد اور جید عالم تھے میدان میں آگئے ۔ یہ تنازعہ ۱۷۴۱ء اور ۱۷۴۳ء کے درمیان شروع ہوا ۔ اور اسی زمانے میں انھوں نے اپنا رسالہ "تنبیہ الغافلین" لکھا ۔ "[1]

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ حزین نے خان آرزو کے کسی اعتراض کا جواب کیوں نہیں دیا ؟ اس بات سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نہ تو وہ بد مزاج تھے اور نہ ہی ان میں تکبر و غرور تھا ۔ جیسا کہ ان کے بارے میں مشہور ہے ۔ کوئی اور مثال ان کے تکبر اور بد مزاجی کی کہیں نظر نہیں آتی ۔ حزین نے تو "تنبیہ الغافلین" کے جواب میں کچھ نہیں کہا لیکن کچھ اور لوگوں نے اس کے جوابات لکھے تھے مثلاً وارستہ نے رجم الشیاطین نامی ایک رسالہ اس کی تردید میں لکھا تھا ۔ اس کے علاوہ کئی اہل فن نے اپنے اپنے طور پر آرزو کے بعض بعض اعتراضات کے جواب لکھے ہیں چنانچہ لالہ ٹیک چند بہار نے "بہار عجم" میں، وارستہ نے "مصطلحات الشعرا" میں غلام علی آزاد نے "خزانۂ عامرہ" میں اور فتح علی گردیزی (صاحب تذکرہ شعرائے اردو) نے رسالۂ "ابطال الباطل" میں ان کو شامل کیا ہے .....

---

۱ ۔ تاریخ ادب اردو ، جلد دوم حصہ اول ص ۲۳ ، جمیل جالبی

آخر مین صہبائی نے " قول فیصل " مین" تنبیہ الغافلین کے اعتراضات پر اپنا فیصلہ دیا ہے .... [1]

ان سب مین صہبائی کا رسالہ" قول فیصل" بہت اہم اور مشہور ہے ۔ چونکہ صہبائی فارسی شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے تھے لہذا خان آرزو کے اعتراضات کے جواب مین انھون نے فارسی کے مستند اور استاد شعرا کے کلام سے اپنی بات کو ثابت کرنے اور مستحکم بنانے کی کوشش بھی کی تھی ۔ اس کے علاوہ اپنا فیصلہ دینے مین جانبداری سے بھی احتراز کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا رسالہ " قول فیصل " ان کے زمانے مین نیز زمانۂ مابعد مین ، اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے ۔ صہبائی کو بھی اپنے اس رسالے پر ناز تھا جیسا کہ اس رسالے کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اکبرالہ آبادی نے ان کی شہادت پر جو شعر کہا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبائی کی شہرت " صاحب قول فیصل " کی حیثیت سے بھی کافی تھی ۔ اکبرالہ آبادی کا شعر ہے ۔

وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل

ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

چونکہ اس زمانے مین شعر مین ندرت خیال سے زیادہ ندرت بیان پر توجہ دی جاتی تھی اس لئے اسلوب بیان ہی زیادہ تنقید کا نشانہ بنتا تھا ۔ بقول خواجہ حامد ۔

" شعر کی قدر و قیمت کا انحصار قلب شعر کے بجائے قالب شعر کی خوبی و زشتی پر تھا لہذا تنقید کے دائرے مین زیادہ تر الفاظ ، تراکیب ، محاورات اور نکات شعری آتے تھے ۔ کبھی کبھی جملون کی نحوی ترکیب اور خیال کی زیبائی و نہ زیبائی کا جائزہ بھی لے لیا جاتا تھا ۔

---

۱ ۔ امام بخش صہبائی ، ص ۱٤٤

خان آرزو کے اعتراضات کی کثیر تعداد زبان سے تعلق رکھتی ہے اور زبان میں کسی غلطی کا سرزد ہونا شیخ حزین جیسے اہل زبان و صاحب کمال سے بعید تھا لہذا صہبائی نے اساتذہ کے کلام کی سند کے ساتھ ان کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ بقیہ اعتراضات کا تعلق زبان سے نہیں دیگر باتوں سے ہے۔ ان میں سے بعض کا جواب دیا ہے، بعض کے لئے کہا ہے کہ یہ بات شاعروں کے یہاں عام ہے۔ بعض کے ضمن میں نقص کو تسلیم کیا ہے۔"[1]

صہبائی خان آرزو اور شیخ حزین دونوں کو اپنی اپنی جگہ صاحب علم و فضل اور قابل نیز مستند استاد تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے رسالے "قول فیصل" کے آغاز میں دونوں استادوں کا ذکر انتہائی احترام سے کرتے ہیں اور ان دونوں کو مثل ایک شخص کی دو آنکھوں کے تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی ایک آنکھ کی حفاظت کی خاطر دوسری آنکھ کی بینائی ختم کرنا نہیں چاہتا۔ بالکل اسی طرح مندرجہ بالا دونوں استادوں کی عزت و احترام ہر شخص پر واجب ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ سہو اور غلطی انسان کی سرشت میں داخل ہے لہذا اگر کسی سخنور سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ دوسروں کے عیب ظاہر نہ کرے تاکہ اس کے اندر بھی کوئی عیب نہ نکالے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص انصاف کے ساتھ میری تحریر کا جائزہ لیگا تو وہ دیکھے گا کہ اس میں میں نے کسی ایک کے ساتھ رعایت یا باسداری سے کام نہیں لیا ہے یعنی اس معاملے میں میں نے اپنی رائے دینے میں انصاف کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔

۱۔ امام بخش صہبائی، ص ۱۴۵

ذیل مین خود ان کے الفاظ مین ــــ

" خداوند ظلوم و جهولی که زیان از سود نشناسد و نیك از بد باز نداند باین همه بی تمیزی از امداد توفیقت دست بعیب و هنر مردم نیالاید ۰۰۰۰ چشم از عیب خود پوشیدن و در نیك و بد مردم فرودیدن از کوریست سبحان الله طبیب از بیماری خود خبرباز نگرفته در تشخیص اسقام دیگران در می آید ۰۰۰۰۰ انگشت بر حرف کس منه تا ناخن در حرفت بند نکنند و خار در بستر کس مشکن تا نشتر در پهلویت نشکنند ۰۰۰ هر یکی را چون دیده و دل از درد دیگری خون گریستن ست و چون بادام دو مغز در آغوش هم شاد زیستن همگنان را حکم اعضای تن ست ۰۰۰۰۰ سعدی در سفته انچه گفته ــــ

چو عضوی بدرد آورد روزگار

دگر عضوها را نماند قرار

پس دفع اذیت دیگران را چارهٔ درد خود فهمیدن ست که با شهسواران عرصهٔ کمال عنان بر عنان تازد و خویش را از دعوی همسری این بلند پائگان در مغاك بی اعتباری اندازد و هر گاه خود میداند که ایرانی نژادی اگر صد سال در هند بگزراند در فصاحت زبان ارد و باچهار ساله طفلکی برنیاید ۰۰۰۰۰ "[1]

ذیل مین مثال کے طور پر حزین کے چند اشعار پیش کئے جا رہے هین جن پر خان آرزو نے اعتراضات کئے تھے اور صہبائی نے اپنے رسالے " قول فیصل " مین ان کے جوابات مع سند کے درج هین ــ

۱ــ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصه دوم ، ص ۲ ، ۳

حزین کا شعر ہے ــــ

(۱) تا بوسۂ آن حسن گلو سوز چہ باشد

نام لب او کام مرا در شکر انداخت

آرزو کا اعتراض ہے کہ شکر در کام می باشد نہ کام در شکر ــ صہبائی اس کے جواب مین کہتے ہین کہ یہ صحیح ہے کہ شکر حلق مین ہوتی ہے نہ کہ حلق شکر مین ــ لیکن اگر کثرت کے لئے مبالغے کے ساتھ اس طرح کہا جائے تو بھی دائرۂ صحت سے باہر نہین ہوگا ــ سند اس کی یہ ہے کہ ملا نورالدین ظہوری نورس کے دیباچے مین لکھتے ہین " کام سخن در شکر افتادۂ شیرینیٔ ادا " ایک جگہ نظیری کہتا ہے ــــ

" لبان شکریست را مکیدن ــــ زبان در کام در شکر نہادن

(۲) زاہد بیاوردی براہ صواب کن

بگزار دل زدست و بساغر شراب کن

آرزو اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہین کہ شناسائی اسالیب کلام فارسی جانتا ہے کہ ایک ریاکار زاہد جو ہمیشہ شاعر کا مخاطب اور معتوب رہا ہے اس کو دل سے کوئی واسطہ نہین ہوتا ــ اس صورت مین یہ مصرعہ اگر یون ہوتا تو بہتر تھا ــــ

بگزار سبحہ را و بساغر شاشراب کن

صہبائی جواب مین کہتے ہین کہ دل از دست گزاشتن کنایہ ہے بے صبر اور بے قرار ہونے کے لئے ــ اگر کہین کہ ایک زاہد صد سالہ نے اس نازنین کے چہرے کو دیکھ کر دل ہاتھ سے دیدیا (یعنی بے قرار ہوگیا) تو یہ کس طرح صحیح نہین ہوگا ــ دل ہر شخص رکھتا ہے چاہے وہ صالح ہو یا طالح (مراد نیک ہو یا سفاک) ــ ۲

۱ــ کلیات صہبائی ، جلد دوم ، حصہ دوم ، ص ۹۲

۲ــ ایضاً

(۳) نمودی جلوهٔ ای شیرین شمائل در خیال من

حنائ پای گلگونت شود خون حلال من

آرزو کا اعتراض ہے کہ لفظ حلال سے اس جگہ کیا فائدہ ہے۔

صہبائی کہتے ہین کہ یہ بات پوشیدہ نہین کہ اکثر لوگ اس اندیشے سے کہ خون بہانا دنیا و آخرت مین باز پرسی کا سبب ہوتا ہے قتل سے ہاتھ روک لیتے ہین اور جب یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ خون حلال ہے تو ممکن ہے کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے خون بہانے کو تیار ہوجائین۔ پس از لفظ کا فائدہ عاشق کا حصول مدعا ہے اور یہ بات تو ایک عاشق کی سمجھ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ فائدہ مند بات اور کیا ہوسکتی ہے[1]

(٤) غوطه در خون خود از فرق زند تا بقدم

بشهید تو نزیبد کفنی بهتر ازین

آرزو کہتے ہین کہ جب غوطہ خورد ن شہر مین آگیا پھر فرق تا قدم کی قید نہایت بیجا ہے۔

صہبائی جواب مین کہتے ہین کہ جب یہ لفظ مکمل طور پر پانی مین ڈوبنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو فرق تا قدم کہنا کیونکر غلط ہوگا۔ دیکھنا چاہئے کہ طالب آملی کیا کہتا ہے ــــ

بخون دل زده ام عوطه تا بگردن و خلق

گمان برند که دارم زه گریبان سرخ

مولوی جامی کہتے ہین ــــ

چنان در لجهٔ عشق توام غرق

کزو خالی نیم از پای تا فرق [2]

۱ــ کلیات صہبائی، جلد دوم حصہ دوم، ص ۹۱-۹۲

۲ ــ ایضاً ص ۹۳

صہبائی کی مندرجہ بالا تصنیفات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد ایک قاری آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ علمی اور ادبی مسائل اور زبان و لغات نیز قواعد کے مسائل پر ان کو پوری طرح عبور حاصل تھا ۔ وہ لسانی اور لغوی علوم کے بحر بیکران کے غواص و شناور تھے ۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اساتذۂ فارسی کے آثار و تصانیف پر گہری نگاہ بھی رکھتے تھے ۔ اپنی بات کے ثبوت میں اساتذہ کے کلام سے امثال و شواہد پیش کرنا ان کے لئے کچھ دشوار نہ تھا ۔ چنانچہ حسب ضرورت مثال کے طور پر اشعار کا استعمال ان کی تصانیف میں بکثرت پایا جاتا ہے ۔ اپنے ذہن رسا کی بدولت شعر و ادب کے لطیف و دقیق نکات کو حل کرنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے میدان ادب میں فن شرح نگاری پر خصوصی توجہ دی اور اس کو ادب میں ایک اعلی مقام دلوانے میں حتی الامکان کوشش کی جس کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا ۔

باب چہارم

صہبائی بحیثیت شرح نگار

۱۔ مختلف ادبی تصانیف اور ان کی شروح

۲۔ صہبائی کی شروح کی ادبی و لسانی خصوصیات

۳۔ ظہوری اور صہبائی

صہبائی بحیثیت شرح نگار

جیسا کہ صہبائی کی علمی نگارشات کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ وہ اساتذۂ فارسی کے آثار پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ علاوہ ازیں دلی کالج میں فارسی کے استاد ہونے کی حیثیت سے اس زمانے میں جو علمی و ادبی شاہکار نصاب تعلیم میں داخل تھے ان سے وہ بخوبی واقف تھے ۔ جیسا کہ قبلاً کہا جاچکا ہے کہ نصاب تعلیم میں بیشتر "سبک ہندی" کے نمایندہ علمی شاہکار ، جو ترصیع ، سجع ، تناسب لفظی ، مترادفات ، اطناب کلام اور دوسری فنی لوازمات سے مزین ہوتے تھے ، شامل تھے ۔ اس قسم کے دقیق اور فنی خصوصیات سے متصف تصانیف کو سمجھنا ایک عام قاری کے لئے آسان نہ تھا ۔ صہبائی چونکہ خود ایک مدت سے ان تصانیف کا مطالعہ اور اس کی تدریس میں مشغول رہے تھے اس لئے وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ کسی استاد کی مدد یا شرح کے بغیر ان شہ پاروں کے گہرے مطالب تک عام قاری یا طالب علم کا ذہن نہیں پہنچ سکتا ۔ چنانچہ اپنے طالب علموں اور فارسی زبان و ادب کے شایق اور دلدادہ حضرات کی سہولت اور آسانی کے لئے ، ان متون کی شرحیں لکھنے کا خیال ان کے ذہن میں آیا ۔ شرح نویسی ان جیسے عالم و باکمال شخص کے لئے کچھ زیادہ مشکل بھی نہ تھی کیونکہ ان شاہکاروں کی درس و تدریس کے دوران صہبائی کو ان کے مطالب کے اظہار پر قدرت بھی حاصل ہوگئی تھی ۔ علاوہ ازیں ان کی دور رس نگاہوں نے آنے والے دور میں ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے انحطاط کو پوری طرح محسوس کرلیا تھا ۔ اور اس امر کا انھیں پورا یقین ہوگیا تھا کہ فارسی ادب کے مشہور اساتذہ ، جنھوں نے اپنی جودت طبع ، ذہن نکتہ رس اور

فکر د قیق کے ذ ریعے جو گہرے نقوش فارسی ا د ب مین علمی و ا د بی شاہپا رون کی شکل مین چھوڑے ہین ، مستقبل قریب مین ا ن کو بڑھنے ا ور سمجھنے والے نہ رہین گے ۔ چونکہ اس وقت تک فارسی زبا ن کی جگہ ارد و نے لے لی تھی ا ور رفتہ رفتہ فارسی زبا ن کے پڑھنے ا ور سمجھنے والے کم ہورہے تھے ۔

ا ن حالات کے پیش نظر ا نھون نے چند ایسے د قیق شاہکا رون کو آسا ن ا ور قا بل فہم بنا نے کی ذ مہ د اری ا پنے ذ مہ لی ا ور ا پنے لئے میدا ن ا د ب مین شرح نویسی کا میدا ن چن لیا ۔ صہبائی نے اس اہم ذ مہ د اری کو نہ صرف کا میا بی کے سا تھ نبھا یا بلکہ فن شرح نویسی کو میدا ن ا د ب مین ترقی کی را ہ د کھا ئی ۔ د وسرے الفاظ مین کہا جا سکتا ہے کہ ا نھون نے ا پنے لئے میدا ن ا د ب مین ا یک نئی را ہ نکا لی ا ور د نیائے ا د ب مین ا یک شارح کی حیثیت سے خود کو روشناس کرا یا ا ور گویا اس کے متخصص قرار پائے ۔ اس مین شک نہین کہ یہ شرح نویسی اس وقت کی ا یک بہت بڑی ضرورت تھی جس کو صہبائی کی د ور رس نگا ہین ہی سمجھ سکتی تھین ۔ بد قسمتی سے وہ زیا د ہ د ن زند ہ نہ رہ سکے ا ور ا کیا ون برس کی عمر مین ا نگریزون کی گولیون کا نشا نہ بن گئے ۔ ا گر ا ن کی زند گی کچھ ا ور د ن وفا کرتی تو یقینا " آج چند ا ور مشکل ا ور اہم متون کی شروح ہمارے مطا لعے کو آسا ن ا ور وسیع بنا نے مین مد د کرتین ۔

صہبائی نہ صرف علم لغت ، علم بیا ن ا ور قواعد کے اصولون سے وا قفیت رکھتے تھے بلکہ محا ورات ، امثا ل و حکم ا ور تلمیحات پر بھی ا ن کو عبور حا صل تھا ۔ اس وجہ سے ا ن متون کی شرح نویسی ا ن کے لئے آسا ن ہوگئی تھی ۔ کیسا ہی لطیف خیا ل یا د قیق نکتہ کیون نہ ہو وہ اس کی تہہ تک آسا نی سے پہنچ جا تے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ علمی و ا د بی مسائل ، فارسی زبا ن ، لغات ا ور قواعد کے مسائل پر ا ن کو جتنی

قدرت حاصل تھی وہ ان کے ہم عصر ادبا میں سے کسی کو حاصل نہ تھی ۔
وہ لسانی اور لغوی علوم کے بھی ماہر تھے ۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور
وہ مشہور و معروف فارسی کے اساتذہ کے آثار و تصنیفات پر گہری نظر رکھتے تھے ۔
یہی وجہ تھی کہ وہ جگہ جگہ بطور سند اساتذہ کے اشعار سے شواھد پیش کرکے اپنی
بات کو باوزن بنانے میں ملکہ رکھتے تھے ۔ جیسا کہ ان کے چند رسالوں سے ظاہر ہے
جو اساتذہ کے اشعار کی وضاحت اور محاوروں و ترکیبوں میں تبدیلی وغیرہ پر مشتمل
ہیں ۔

سچ تو یہ ہے کہ اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ ، علم کلام اور فن بدیع سے
واقفیت ، شعر فہمی و نکتہ سنجی نیز نقد و نظر کی صلاحیت جیسی خصوصیات نے
مل کر ان کی طبیعت کو فن شرح نویسی کی طرف مائل کیا تھا ۔

فن شرح نویسی کا آغاز اگرچہ صہبائی سے قبل ہوچکا تھا لیکن صہبائی نے اس کو
ترقی کی راہ پر گامزن کیا ۔ صہبائی سے قبل بھی اگرچہ سہ نثر ظہوری کی کئی شرحیں
لکھی جاچکی تھیں ۔ سہ نثر ظہوری جیسی مرصع و آراستہ عبارت کو سمجھنا آسان نہ تھا
چنانچہ اس کی شرحیں لکھنے کا آغاز صہبائی کے دور سے قبل ہی ہوگیا تھا ۔ صہبائی
کے دور میں عبد الرزاق یمینی کی شرح " مقدمات ظہوری " مقبول عام تھی لیکن
صہبائی اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے لہذا انھوں نے خود اس کی شرح لکھنے کا
فیصلہ کیا اور غالباً " اس شرح کے ساتھ ہی انھوں نے شرح نویسی کا آغاز کیا تھا ۔
شرح لکھتے وقت ان کے پیش نظر کم سے کم تین شرحیں تھیں جن کے حوالے انھوں نے
اپنی شرح میں کئی جگہ دئے ہیں ۔ یعنی عبد الرزاق یمینی کی " مقدمات ظہوری "

فقیر اللہ قادری کی شرح اور مولوی غلام جیلانی رامپوری کی شرح ۔ موخرالذکر دونون شرحین اب نایاب ہین ۔[1]

اس کے علاوہ سراج الدین علی خان آرزو جو اپنے زمانے کے فارسی کے مسلم الثبوت اور مستند استاد سمجھے جاتے تھے انھون نے کثرت سے کتب علمی تصنیف یا تالیف کی تھین ۔ انھون نے چند کتابون کی شروح بھی لکھی تھین جیسے شرح سکندر نامہ ، شرح زلیخا اور شرح گلگشتی وغیرہ ۔[2]

صہبائی نے شرح نویسی کے لئے جن متون کا انتخاب کیا ان مین " سہ نثر ظہوری " کا نام سرفہرست آتا ہے ۔ اس کے علاوہ مینا بازار ، پنج رقعہ ، شبنم شاداب ، حسن و عشق ، معمائی نصیرای ہمدانی اور معمائے جامی وغیرہ کی شرحین بھی انھون نے لکھی تھین ۔

مختلف ادبی تصانیف اور ان کی شرحین ۔

ا ۔ سہ نثر ظہوری ۔

ملا نورالدین ظہوری ترشیزی اکبری عہد مین ابراہیم عادل شاہ ثانی ، سلطان بیجاپور کے درباری شاعر تھے ۔ ان کا زمانۂ حیات ۹۴۴ ھ تا ۱۰۲۵ھ ہے ۔[3] ظہوری اصلاً ایرانی تھے ۔ ایران کے دیگر شعرا کی طرح وہ بھی ہجرت کرکے ہندوستان آگئے اور ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور کے دربار سے منسلک ہوگئے ۔ ظہوری اپنے عہد کے مشہور و معروف شاعر اور نثرنگار تھے ۔ انھون نے ہر صنف سخن مین طبع آزمائی کی تھی ۔ ایک ساقی نامہ بھی برہان نظام شاہ والیٔ بیجاپور کے لئے

ا ۔ امام بخش صہبائی ، ص ۱۵۵
۲ ۔ نگارستان فارس ، ص ۲۲۳
۳ ۔ سرو آزاد ، فصل دوم ، ص ۳۴ ، ظہوری لائف اینڈ ورکس ، ص ۳۲

لکھا تھا ۔ ان کے حالات زندگی ہر تذکرے میں مل جاتے ہیں اس لئے یہاں پر تفصیل سے احتراز کیا جارہا ہے مختصراً یہ کہ اس امر میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ ایک شاعر اور نثرنگار کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند تھا ۔ محمد حسین آزاد ان کے بارے میں لکھتے ہیں ــــ

" اس کی (ظہوری) رنگین بیانی اور نازک خیالی پر تمام اہل سخن کا اتفاق ہے کہ نظم و نثر میں لاثانی ہے ۔ طرز اس کی سب سے علحدہ ہے اور وہ اس کی ایجاد ہے ۔ نہ کسی نے پہلے اس ڈھنگ میں کہا ۔ نہ بعد اس کے کوئی قدم پر چل سکا ۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مقفی لکھتا ہے لیکن جس فقرے کو جس سے پیوند دیدیا ہے وہ ایسا ہے کہ تبدیل نہیں ہوسکتا ....."[1]

غلام علی آزاد ظہوری کے بارے میں لکھتے ہیں ــــ

" سواد معنی را روشن ساخت خوش بیانی از و ذخیرہ اندوز افتخارہا و شیوا زبانی ازو چہرہ افروز اعتبارہا مثنوی را بکرسی عجبی نشاندہ و نثر را از جواہر زواہر گزراندہ بعد اکتساب حیثیات از ولایت ایران بدکن افتاد و آستان ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور را قبلۂ آمال خود ساخت ....."[2]

ظہوری کی سہ نثر دراصل تین دیباچوں کا مجموعہ ہے ۔ پہلا دیباچہ یعنی دیباچۂ نورس اس وقت کے مشہور ابراہیم عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کی فن موسیقی

---

۱ ۔ نگارستان فارس ، ص ۱۴۲
۲ ۔ خزانۂ عامرہ ، ص ۳۱۳

پر کتاب " نورس " کا دیباچہ ہے ۔ یہ کتاب ابراہیم عادل شاہ نے دکنی زبان میں مختلف راگنیوں پر لکھی تھی ۔ اس پر ظہوری نے دیباچہ (۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء) لکھا تھا ۔[1]

دوسری نثر یعنی دیباچۂ گلزار ابراہیم ظہوری نے ۱۰۰۸ھ / ۱۵۹۹ء کے قریب تصنیف کیا تھا ۔ یہ دیباچہ ان نظموں کے مجموعے پر لکھا گیا تھا جو ظہوری اور اس کے خسر ملک قمی نے ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں لکھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا نام " گلزار ابراہیم " رکھا گیا ۔[2]

تیسری نثر یعنی دیباچۂ خوان خلیل (۱۰۱۲ھ / ۴ ـ ۱۶۰۳ء) کے لئے لکھا گیا ۔ خوان خلیل بھی ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں ظہوری اور ملک قمی کی کہی ہوئی نظموں کا مجموعہ ہے ۔[3]

ان تینوں دیباچوں کو یکجا کرکے اس کا نام " سہ نثر " رکھ دیا گیا اور چونکہ یہ ظہوری کی تصنیف ہیں اس لئے " سہ نثر ظہوری " کے نام سے مشہور ہوئے ۔ یہ دیباچے نہ صرف فارسی زبان میں انشا پردازی کے بہترین نمونے شمار کئے جاتے ہیں بلکہ سبک ہندی کے بہترین اور اعلیٰ ترین نمایندہ بھی کہے جا سکتے ہیں ۔

" سہ نثر " کی زبان مرصع ، مسجع اور مقفی ہے ۔ اس کے علاوہ حسن تعلیل ، تناسب لفظی ، ایہام ، تراکیب نو اور دیگر صنائع و بدایع کا استعمال بھی بکثرت پایا جاتا ہے ۔

شرح سہ نثر ظہوری ۔

" سہ نثر ظہوری " اپنی دقیق اور مرصع و مسجع تحریر کے سبب صاحب علم لوگوں

---

۱ ـ ظہوری لائف اینڈ ورکس ، ص ۱۷۸
۲ ـ ایضاً
۳ ـ ایضاً ص ۱۹۰

کے لئے کشش کا باعث تھی ۔ چنانچہ صہبائی سے قبل بھی کئی اہل علم و فضل نے اس کی شرح لکھین ۔ ان مین عبد الرزاق یمینی ، فقیر اللہ قادری اور مولوی غلام جیلانی کی شرحین کافی مشہور تھین ۔ موخرالذکر دونون شرحین جو اب نایاب ہین ، صہبائی کے زمانے مین ضرور موجود رہی ہونگی ، جیسا کہ شرح سہ نثر ظہوری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کیونکہ صہبائی نے اپنی شرح مین کئی جگہ ان کے حوالے بھی دئے ہین ۔ لیکن صہبائی کی محققانہ طبیعت اور ان کا علم و فضل ان شرحون سے مطمئن نہ ہوسکا اس لئے انھون نے خود اس کی شرح لکھنے کا ارادہ کرلیا ۔

صہبائی نے "سہ نثر ظہوری" کی شرح لکھنے مین بڑی کاوش اٹھائی تھی اور اس مین کوئی شک نہین کہ شرح لکھنے مین انھون نے مصنف کی جیسی دقت فکر سے کام لیا تھا ۔ جیسا کہ شرح سہ نثر کے دیباچے مین وہ خود کہتے ہین ——

" بعضی از مقامات سہ نثر ملا نورالدین ظہوری کہ خزینۂ نقود فصاحت و نقد گنجینۂ بلاغت است طراز دامن تحریر ساختہ شاہد اشکال آنرا بخطوط عبارت شرح مخطط نماید .... بی اختیار دست و قلم مامور شغل تحریر گردید از مبصران باریک بین کہ روی صفحۂ انشای شان بقول نقطۂ خال از دوائر صد گرہ برجبین نیزند و خطوط جدول اوراق شان بر اندیشۂ حلکاری زر گل خط می کشد امید کہ بدیدۂ انصاف نگریستہ دقت فکر ہیچمدان را در تحریر معانی آن کج از مصنف خیال نہ کردہ اندیشہ را درین معنی بکار دارند کہ در تصحیح بعضی مقامات کہ متعدی کور سوادیہای کاتبان ہمچنان تاغایت بشکنجۂ نامربوطی در ماندہ بود چہ قدر خون جگر در کاسۂ خود نمودہ[1]

۱۔ کلیات صہبائی ص ۱۰۴

جیسا کہ صہبائی خود کہتے ہین کہ کاتبون کی بے سوادی اور کم علمی کے سبب جو مقامات غیر مربوط ہوگئے تھے، انھون نے بڑی محنت اور کوشش سے ان کی تصحیح بھی کی تھی جو یقیناً ایک دقت طلب کام ہے۔ اور ان کی طبیعت کی احتیاط پسندی کا ثبوت بھی ہے۔ صہبائی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امتداد زمانہ سے یا کاتب کی غلطی سے اکثر متون مین کچھ تصرف بھی ہوجاتے ہین اس لئے تشریح لکھنے سے قبل متن کی مستند نسخون کی مدد سے تصحیح کرنا بھی انتہائی ضروری ہے چنانچہ انھون نے شرح لکھتے وقت اس قسم کے مشتبہ مقامون کی تصحیح بھی کی تھی۔

"سہ نثر" کے مصنف نے موسیقی سے متعلق اصطلاحات اور عبارت سے لے کر قرآن اور حدیث کی تلمیحات نیز ایرانی اور ہندوستانی اساطیر کے حوالے بھی کافی دئے ہین۔ صہبائی نے نہ صرف ان سب اصطلاحات اور حوالون کی تشریح بڑی تفصیل اور کامیابی کے ساتھ کی بلکہ زبان کی مشکلات یعنی علم بیان و بدیع یا لغات و محاورات کی تشریح بھی بڑے محققانہ اور عالمانہ انداز مین کی ہے۔ جیسا کہ قبلاً کہا جاچکا ہے کہ علم عروض و قوافی، صنائع و بدایع، تراکیب و محاورات نیز تلمیحات وغیرہ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے اور وہ ان پر کامل مہارت رکھتے تھے۔

حافظ احمد حسین شوکت ابنی فارسی تقریظ مین اس کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہین ــ

"این شرح درخور آنست کہ طالبان اساتذہ او را حرز بازوی استعداد خود نمایند و چنانکہ مرتبۂ فصاحت و بلاغت ظہوری را بمیزان خرد خداداد خود سنجند ہمچنان پایۂ تحقیق مولانا صہبائی را ہم بچشم تعمق نگرند"۔[1]

۱۔ کلیات صہبائی، جلد دوم، حصہ دوم، ص ۳۳

صہبائی کی شرح ۳۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور کلیات صہبائی (جلد دوم حصہ اول) میں شامل ہے ۔ صہبائی نے اپنی شرح میں متعدد کتب لغات اور اہل زبان اساتذہ کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے ۔

لغات میں کشف اللغات ، چراغ ہدایت ، منتخب اللغات ، برہان قاطع ، بہار عجم ، سراج اللغت ، فرہنگ جہانگیری ، قاموس ، موید الفضلا ، کنز اللغات وغیرہ اس کے علاوہ دبستان مذاہب ، مینا بازار ، گلستان ، جواہر الحروف ، شرح سکندر نامہ ، پنج رقعہ ، جامع التواریخ ، مجمع الانساب ، کامل التواریخ مفتاح العلوم ، منشات نصیرائے ہمدانی ، رسالہ سراج منیر ، وغیرہ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے اور حسب ضرورت سند کے طور پر پیش کیا ہے ۔[1]

۲۔ مینا بازار ۔

مینا بازار کے بارے میں کافی اختلاف رائے رہا ہے ۔ کچھ تذکرہ نگار اس کو ظہوری کی تصنیف بتاتے ہیں اور کچھ ارادت خان واضح کی ۔ غالباً سب سے پہلے لالہ تیک چند بہار نے بارھویں صدی ہجری کے اواسط میں اپنی فرہنگ بہار عجم میں مینا بازار کو نورالدین ظہوری کی تصنیف بتایا ۔ مشہور فرہنگ غیاث اللغات اور فرہنگ آنند راج کے مولف نیز اپنے زمانے کے مشہور شرح نگار عبدالرزاق سورتی اور انیسویں صدی کے مشہور فارسی کے استاد اور شرح نگار امام بخش صہبائی بھی مینا بازار کو ظہوری کی تصنیف بتاتے ہیں ۔ بوڈلین لائبریری کے مشہور فہرست نگار ڈاکٹر ایتھے بھی مینا بازار کا مصنف ظہوری کو ہی بتاتے ہیں ۔

۱۔ امام بخش صہبائی ص ۱۸۰

غالباً سب سے پہلے احمد علی سندیلوی نے اپنے تذکرے "مخزن الغرائب" میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مینا بازار کی بابت جو ان دنوں بہت مشہور ہے لوگوں کا خیال ہے کہ واضح کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے "مینا بازار" کے مصنف کی حیثیت سے ارادت خان کا نام بھی سامنے آگیا اور تذکرہ نگار اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کو دونوں میں سے کسی ایک کے نام منسوب کرتے رہے۔ محمد حسین آزاد اپنی کتاب نگارستان فارس میں لکھتے ہیں ــــ

"مینا بازار کو کچھ ناواقف لوگ مشہور کرتے ہیں کہ ظہوری کا ہے مگر اہل تحقیق سے سنا گیا ہے کہ ارادت خان کا ہے۔"[۱]

ان کے اس بیان سے بیشتر حضرات اس کو ارادت خان واضح کی طرف منسوب کرنے لگے جبکہ آزاد کا بیان خود مشتبہ سا ہے۔ اہل تحقیق حضرات کے بارے میں انہوں نے کچھ نشاندہی نہیں کی ہے۔

ان تذکرہ نگار حضرات کی رائے کو ثانوی ماخذ کہا جاسکتا ہے۔ اصل چیز داخلی شہادت ہوتی ہے۔ یعنی مینا بازار کے متن کو پڑھنے کے بعد اس کی تحریر میں کسی حوالے سے یا اس کے اسلوب نگارش سے کچھ اندازہ لگایا جائے۔

اس موضوع پر رسالہ "معارف" میں ڈاکٹر محمد احمد (الہ آباد یونیورسٹی) اور ڈاکٹر نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) کے درمیان ایک بحث چھڑ گئی تھی جو کافی دنوں تک چلتی رہی اور معارف کے کئی شماروں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس بحث سے مینا بازار کے موضوع پر تمام حقائق عیاں ہوگئے اور داخلی و خارجی شہادتوں کے ساتھ منظر عام پر آگئے۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ ثابت ہوگیا

۱۔ نگارستان فارسی، ص ۱۴۳

کے مینا بازار کے مصنف ظہوری ہی ہین ۔ ذیل مین چند نکتے اس کے ثبوت مین پیش کئے جا رہے ہین ۔[۱]

۱۔ متاخرین تذکرہ نویس جو بیشتر واضح سے قریب تر زمانے کے تھے وہ بھی مینا بازار کو واضح کی بجائے ظہوری کی تصنیف بتاتے ہین ۔

۲۔ ظہوری کی کلیات مین اگر مینا بازار شامل نہین تو وہ کسی اور کی کلیات مین بھی شامل نہین ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ مینا بازار کسی کی فرمائش پر الگ سے لکھی گئی ہو ۔

۳۔ مینا بازار مین اگر ابراہیم عادل شاہ (جو ظہوری کا ممدوح رہا ہے) کی مدح نہین ہے تو کسی اور بادشاہ کی مدح بھی نہین ہے ۔

۴۔ کتاب مین ایک شعر ظہوری کے ساقی نامہ کا ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ظہوری کی ہی تصنیف ہے ۔[۱]

اسکے علاوہ کتاب کی داخلی شہادتین بھی یہ ظاہر کرتی ہین کہ وہ ظہوری کی ہی تصنیف ہے ۔ کیونکہ اس کا اسلوب نگارش ظہوری کی " سہ نثر" کے اسلوب سے قریب تر ہے جبکہ ارادت خان واضح، صرف تاریخ مین ہی نہین بلکہ اپنی مثنوی " آئینۂ راز کے دیباچے مین بھی سادہ زبان استعمال کرتے ہین ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ارادت خان سادہ اور بے تکلف اسلوب نگارش کو پسند کرتے تھے جبکہ "مینا بازار" کی زبان مرصع اور رنگین ہے، نیز مضمون مین نازک خیالی کا امتزاج بھی ملتا ہے ۔ البتہ " مینا بازار" اور "سہ نثر" مین اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ "سہ نثر" ظہوری کی شاہکار تصنیف ہے اور "مینا بازار" ایک عام تصنیف ۔ یہ ضروری نہین کہ کسی مصنف کی ہر تصنیف ہی شاہکار ہو ۔

۱۔ " مینا بازار کا مصنف " (مضمون) ، ص ۸۰ ۔ ۳۷۹ ، معارف نومبر ۱۹۵۴ء

مینا بازار ٤٤ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے۔

" عصمتیان روبوش حیا پرور و خلوتیان عفت کوش پاک نظر را مژدہ باد کہ وقت گرمی بازار نشاط است و بسط بساط انبساط یعنی زنانہ بازاری ملائک نظر فریب دلنشین تمام زیب ترتیب یافتہ کہ از کمال دلبستگی ....."

تقریباً پانچ صفحوں میں مینا بازار کی بحیثیت مجموعی تعریف کرنے کے بعد جوہری، بزاز، گل فروش، حلوائی، عطر فروش، میوہ فروش، تمباکو فروش، پان فروش، سبزی فروش کے بارے میں الگ الگ تفصیل بیان کی گئی ہے۔ آخر میں دو صفحات پر خاتمہ ہے۔ اس کے بعد اس کی طباعت کی تاریخ پر ایک رباعی کہی گئی ہے۔

مینا بازار وچہ رنگین شد طابع

نثرش رنگین بود خطش ہم رنگین ست

موجد شد بہر انطباعش تاریخ

مینا بازار پر ز جنس سنگین ست

١٢٨٥ ھ

بمطابق ١٨٦٩ء

ابوالفضل آئین اکبری میں اس بازار کی تفصیلات لکھتا ہے۔ دراصل اکبر بادشاہ کے زمانے میں مینا بازار کے نام سے ایک بازار لگتا تھا۔ ہر مہینے کی تیسری تاریخ کو یہ بازار آگرہ کے قلعہ سے متصل لگایا جاتا تھا اور اس کی حیثیت ایک جشن کی سی ہوتی تھی۔ مینا بازار سے مطلب زنانہ بازار ہوتا تھا جس میں حسین و جمیل سوداگر خواتین دکانیں لگاتیں۔ محل کی بیگمات مع باندیوں کے خریداری کو

آتی تھین ۔ اس کے علاوہ امرا و اکابر کی بیگمات اور بیگم زادیان خرید و فروخت کو آتی تھین ۔ غرض اس دن بازار کی رونق دیکھنے کے لائق ہوتی تھی ۔ حسن و جمیل دوشیزاؤن اور زہرہ جمال حسیناؤن کا اجتماع آنکھون کو خیرہ کردیتا تھا ۔ اس کا ذکر ظہوری اپنے اس مختصر رسالے مین اپنے مخصوص شگفتہ اور مرصع انداز تحریر مین کرتا ہے ۔ خوبصورت تشبیہات ، رنگین استعارات کا استعمال حسب سابق اس کی تحریر مین پایا جاتا ہے ۔ صہبائی کے زمانے مین اور اس کے بعد تک یہ کتاب ہندوستان کے تقریباً ہر فارسی نصاب مین داخل تھی ۔ طرز تحریر "سہ نثر ظہوری" سے ملتا جلتا ہے البتہ "سہ نثر ظہوری" اپنی خصوصیات کی وجہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے

شرح مینا بازار ۔

شرح مینا بازار کی ابتدا صہبائی حسب عادت خدا کی حمد سے کرتے ہین ۔ ابتدا مین ایک خوبصورت اور دلنشین رباعی ہے ۔

از بندہ خضوع التجا می زیبد
بخشایش بندہ از خدا می زیبد
گر من کنم آنکہ آن ز من نازیباست
تو کن ہمہ آنکہ آن ترامی زیبد

پھر لکھتے ہین کہ ناسازگاریٔ روزگار اور مشاغل کی زیادتی کی وجہ سے شرح سہ نثر کے بعد فوراً "مینا بازار" کی شرح نہ لکھ سکے لیکن جب اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز دونون بیٹے یعنی عبد العزیز اور عبد الکریم سوز کی تعلیم و تربیت کا وقت آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی قلم ہاتھ مین لیا اور مینا بازار ، جس کو خواص ظہوری کی تصنیف اور عوام عمر و زید کے افکار کا ثمرہ جانتے ہین اور جس کی کوئی شرح اس وقت تک موجود نہین ، کی شرح لکھنے کا ارادہ کرلیا اور جو مطالب

ذہن مین آئے ان کو صفحات پر منتقل کر دیا ۔ شرح کے خاتمہ مین خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی محنت اور کاوش جو اس کی شرح لکھنے مین ان کو کرنا پڑی اس کا اظہار کرتے ہین ۔

" ایزد سخن آفرین را سپاس که خامهٔ خام رقم صهبائی هیچ نشناس از تحقیق الفاظ گزیده و تدقیق معانی سنجیده و حل مقامات و کشف مغلقات این کتاب دانش نصاب بنهجی فارغ شد که در پیدایش این چمن و آرایش این گلشن طعنه تقصیر .... مشعل هدایت ناز فروشان شبستان تدریس نیاز مند نتوان گردید ...."[1]

شرح مینا بازار ۱۴۱ صفحات پر کلیات صہبائی (جلد دوم حصہ اول) مین شامل ہے ۲۶۵ ھ / ۱۸۴۹ ء مین مکمل ہوئی ۔ الگ بھی چھپ چکی ہے ۔

۳۔ پنج رقعہ ۔

مینا بازار کی طرح پنج رقعہ کے مصنف کے بارے مین بھی اختلاف رائے رہا ہے ۔ محمد حسین آزاد ظہوری کے تذکرے کے ضمن مین لکھتے ہین ۔

" بعض پنج رقعہ کو بھی اس کا کہتے ہین مگر اکثر انکار کرتے ہین لیکن اگر اس کا نہین تو یہ بھی معلوم نہین کہ کس کا ہے ۔ عبدالرزاق سورتی اور صہبائی پنج رقعہ کو ظہوری ہی کی تصنیف قرار دیتے ہین ان کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ طرز نگارش اور داخلی اور خارجی شہادتین جیسی مینا بازار کی ہین ویسی ہی اس کی بھی ہین "۔[2]

صہبائی بھی پنج رقعہ کو ظہوری کی ہی تصنیف مانتے تھے ۔

۱۔ کلیات صہبائی ، ص ۱۶ ۔ ۱۱۵
۲۔ نگارستان فارس ، ص ۱۴۳

نفس مضمون الگ الگ ہوتے ہوئے بھی اسلوب نگارش کے اعتبار سے دونون مین مشابہت پائی جاتی ہے ۔ مینا بازار اور پنج رقعہ دونون کی عبارت مین مضمون آفرینی و شگفتہ بیانی کا انداز ملتا ہے ۔ حجم کے اعتبار سے بھی دونون مین زیادہ فرق نہین ۔ مینا بازار چوالیس صفحات پر اور پنج رقعہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ مینا بازار کی طرح یہ بھی اس وقت کے نصاب مین شامل تھی ۔" پنج رقعہ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پانچ خطوط کا مجموعہ ہے ۔ ہر رقعہ عاشق کی طرف سے لکھا گیا ایک طویل خط ہے ۔

رقعۂ اول ۔ موسوم بہ شہید تبسم دیت ہے ۔

رقعۂ دوم ۔ فراق اور آرزوئے ملاقات کے بارے مین ہے ۔

رقعۂ سوم ۔ حسن و عشق کے ہنگامۂ ازدواج کے نام سے موسوم ہے ۔

رقعۂ چہارم ۔ عید قربان کی مبارکباد کے نام سے ہے ۔

رقعۂ پنجم ۔ شکوۂ ہجر و فراق کے نام موسوم ہے ۔

شرح پنج رقعہ ۔

پنج رقعہ کی شرح ایک سو چوراسی ۱۸۴ صفحات پر مشتمل اور کلیات صہبائی (جلد دوم حصہ اول) مین شامل ہے ۔ الگ سے بھی شایع ہوئی ہے ۔ سہ نثر ظہوری کی طرح پنج رقعہ ظہوری کی بھی کئی شرحین لکھی گئین جن مین عبد الرزاق سورتی کی شرح عمدہ ہے ۔ عبد الرزاق سورتی کا شمار صہبائی سے قبل کے مشہور شارحین مین ہوتا تھا ۔

صہبائی کی شرح پنج رقعہ کے دیباچے کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگون کے اصرار کے باوجود ان کا ارادہ پنج رقعہ کی شرح لکھنے کا نہ تھا ۔ کیونکہ اس قسم کے علمی و ادبی کام کے لئے جو محنت درکار ہوتی ہے اس کے لئے اب ان کی

صحت اجازت نہ دیتی تھی لیکن جب سید احمد خان جن کو وہ " کشور جان و دل کے کارفرما " کے لقب سے یاد کرتے ہیں ، نے فرمائش کی کہ بنج رقعہ کی شرح لکھی جائے تو وہ ان کی فرمائش کو رد نہ کرسکے اور مجبوراً یہ ذمہ داری بھی اٹھانا پڑی ۔[1]

مولوی احمد حسین شوکت اپنی تقریظ میں بنج رقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

" ۰۰۰۰ این کتاب هم بنظر کثرت درس و بلحاظ نازک خیالی مصنف سزاوار تشریح و توضیح بود ۔ نازک خیالی مصنف در خور آن نبود که فهم مبتدیان زبان فارس بدرک آن رسیدی ۔ پس صهبائی آنرا هم فرو نگذاشت و با نحلال نازکخیالی مصنف بحدی جودت طبع را صرف نمود که زائد ازان در عالم خیال نگنجد ۰۰۰ پس صهبائی از شرح خویش بیح و تاب کلام مصنف را دور ساخته ۰۰۰ "[2]

شبنم شاداب ۔

شبنم شاداب کے مصنف ظہیرا ے تفرشی کا نام ظہیرالدین اور تخلص ظہیر تھا ۔ افسوس کہ اس کے بارے میں تفصیل کہیں نہیں ملتی بلکہ بعض تذکروں میں تو اس کا نام بھی نہیں ۔ البتہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرے " ید بیضا " میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ بھی " از شعرا ے تفرش است " پر اکتفا کرتے ہیں ۔ ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے ۔

زبان صوفی دل مرده را حکایت عشق

چو نقش آیت مصحف بود به لوح مزار

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے ۔ ظہیرا ے تفرشی کی تصنیف " شبنم شاداب "

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصہ اول ، ص ۱۱۸ ، ۱۱۹
۲ ۔ کلیات صہبائی جلد دوم حصہ دوم ، ص ۳٤

کا ذکر برٹش میوزیم ، انڈیا آفس لائبریری اور بوڈلین کے کتب خانون کی فہرستون مین بھی ملتا ہے ۔

ظہیرا ے تفرشی، صفوی بادشاہ عباس اعظم اور اس کے عہد کے تاریخ نویس اسکندر بیک، صاحب تاریخ عالم آرای عباسی کا ہم عصر تھا ۔ باغ عباس آباد شاہ عباس کے عہد مین وجود مین آیا تھا ظہیرا ے تفرشی نے باغ عباس آباد کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا وہ انھین کے سامنے وجود مین آیا تھا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہ عباس اور اسکندر بیک کا ہم عصر تھا لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ منشی اسکندر بیک اپنی تاریخ عالم آرای عباسی مین ظہیرا ے تفرشی کا ذکر کہین نہین کرتا، جبکہ اس نے اپنے عہد کے علما و شعرا کا ذکر ان کے وطن کے اعتبار سے کافی تفصیل سے کیا ہے ۔ اہل تفرش کے بیان مین بھی وہ تین اشخاص کا ذکر کرتے ہین ۔ جن کے نام یہ ہین ۔ (۱) محمد حسین تفرشی ، (۲) میر عبد الغنی تفرشی ، (۳) میر صحبتی تفرشی ۔ غالبا" اس کی وجہ یہ تھی کہ تاریخ عالم آرای عباسی کی تالیف کے وقت تک ظہیرا ے تفرشی حیات تھا اور چونکہ تاریخ مین مصنف " متوفا ھا " کا ذکر کرتا ہے اس لئے وہ ظہیرا ے تفرشی کا ذکر " متوفا ھا " کے ذیل مین نہین کرسکتا تھا ۔ تاریخ عالم آرای عباسی کا سن تصنیف ۱۰۲۵ھ ہے اور اس وقت تک ظہیرا ے تفرشی زندہ تھا ۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ " شبنم شاداب " کو ایران مین وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو اس کو ہندوستان مین حاصل ہوئی ۔ ہندوستان مین فارسی کے زوال پذیر دور مین بھی جہان فارسی ادب کے دوسرے شاہکار نصاب تعلیم مین شامل تھے وہین " شبنم شاداب " کی شمولیت بھی ضروری سمجھی جاتی تھی ۔ ایران مین شبنم شاداب اور اس کے مصنف کی گمنامی اور ہندوستان مین اس کی مقبولیت کے اسباب مین سے غالبا" ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس دور مین، شاہان صفویہ کے مقابلے مین، ہندوستان کے

شاہان مغلیہ کی فیاضیان اور زر باشیان ایرانی شعرا اور ادبا کو اپنی طرف کھینچ رہی تھین اور شاہان مغلیہ کی غیر معمولی علم دوستی اور قدر شناسی کی شہرت سن کر تیزی سے ایرانی شعرا ہندوستان آرہے تھے ۔ غالبا" انھین کے ذریعے یہ کتاب ہندوستان آئی اور چونکہ اس کا اسلوب نگارش " سبک ہندی " کے اسلوب کے عین مطابق تھا اور چونکہ اس وقت ہندوستان مین سجع ، ترصیع ، اور صنایع بدایع سے مزین اسلوب نگارش ادبی حلقون مین پسندیدہ نظرون سے دیکھا جاتا تھا اس لئے " شبنم شاداب " کو بھی فارسی ادب مین بہت جلدی وہ مقام حاصل ہوگیا جو ہندوستان مین کچھ اور شاہکارون کو حاصل تھا ۔ ہندوستانی فارسی دانون کے ہاتھون اس کی یہ قدر دانی ہندوستان کے اہل علم کی ادب دوستی کا ایک ثبوت ہے ۔

چند سال قبل محمد نعیم الرحمن نے شبنم شاداب تصحیح و حواشی کے ساتھ مع تقریب کے طبع کرائی جس مین شبنم شاداب کے مضمون اور اسلوب نگارش پر اظہار خیال بھی کیا گیا ہے ۔ اگرچہ اس کے مصنف کے بارے مین ان کی اطلاعات صرف غلام علی آزاد کے مختصر تذکرے پر ہی مبنی ہے ۔

صفوی بادشاہون بالخصوص شاہ عباس کے دور مین فن تعمیر کو بہت ترقی ہوئی شاہ عباس کو باغات لگانے کا بہت شوق تھا ۔ شاہ عباس سے قبل ایران کا پایہ تخت قزوین تھا ۔ سیاسی مصلحت کے باعث شاہ عباس نے قزوین کے بجائے اصفہان کو دارالسلطنت قرار دیا ۔ اصفہان کے قریب عباس آباد مین کافی باغات لگائے جن مین ایک شاہی باغ بھی تھا جسے باغ عباس آباد جدید کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ اس شاہی باغ کی تعریف مین بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی تھی ۔ ظہیرا ے تفرشی بھی ان مین سے ایک تھے ۔ انھون نے شبنم شاداب کے نام سے باغ عباس آباد جدید

کی تعریف و توصیف مین اپنے قلم کی جولانیان دکھائین اور سچ تو یہ ہے کہ اس راہ مین وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہین ۔

شبنم شاداب پچیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جس کی ابتدا مین مصنف نے عباس آباد کے باغات کی تعریف کی ہے پھر وہ شاہی باغ یعنی " باغ عباس آباد جدید " کے حوض ، فوارے ، پودون ، کیاریون ، پھول و غنچون کی تعریف مین تخیل کی گلکاریان دکھاتا ہے ۔ اس کے علاوہ شادی کی محفل اور دربار کی تصویر کشی بھی کرتا ہے ۔ درمیان مین اشعار کا استعمال بھی کرتا جاتا ہے جس کی وجہ سے لطف تحریر دوبالا ہوجاتا ہے ۔ آخر مین سولہ اشعار کا ایک ساقی نامہ بھی ہے ۔ ذیل مین مثال کے طور پر "شبنم شاداب" کی تحریر کا ایک نمونہ پیش کیا جارہا ہے جو " صفت فوارہ و حباب " مین لکھا گیا ہے ۔

" چہ فوارۂ شیرین خیمہ نشین است ، گیسوی دوہر کش رشحہ برتن بلورین افشاندہ ، و پرویز حباب از دور باحشم تمناک بہ تماشا ایستادہ حباب ہا بہ رنگ فاختہ با سرو روان فوارہ در نظر بازی ، و شمع و پروانہ از غیرت گرمی این ہنگامہ در اشک ریزی و جان گدازی ۔ آب کدام ؟ جوش سیماب است کہ از چاہ فوارہ بہ جذب طلائی آفتاب جشن نمودہ و نیزۂ غازیان است کہ نارنج خورشید بہ نوک سنان ربودہ ۔

ز عکس گل و لالہ ، شعلہ سوز
شدہ شمع فوارہ بستان فروز
بہ چوگان فوارہ گوئی حباب
بہ ہر سو زدہ بازو موج آب "[1]

---

۱ ۔ شبنم شاداب ، ص ۱۲ مرتبہ محمد نور نعیم الرحمن

شرح شبنم شاداب ـ

صہبائی نے پچیس صفحات کے اس مختصر رسالے کی شرح بڑی توجہ اور دلجمعی سے لکھی تھی چنانچہ اس مختصر رسالے کی شرح دو سو سات صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ـ یہ شرح کلیات صہبائی (جلد دوم حصہ اول) میں شامل ہے اور علحدہ سے بھی کئی بار چھپ چکی ہے ـ تاریخ خاتمہ " ختم حل مقال " (۲٤۹ ھ / ۸۳۳ ء) سے نکالی ہے ـ جس وقت صہبائی نے یہ شرح لکھی تھی وہ مالی اعتبار سے کافی پریشان تھے چنانچہ اس کے دیباچے اور خاتمہ میں ناسازگاریٔ قسمت ، زمانے کی ناقدری اور اپنی پریشان حالی کا ذکر کرتے ہیں ـ

" ۰۰۰۰ حال آن تیرہ درونان باہل ہنر دادن ملہ چہ معنی دارد و بامداحان ایمای گزارش مدح چہ ممکن کہ اندیشۂ حسن الطلب سراپای عبارت را از شکنجۂ عذر نافہمی بر نمی آرد درین صورت بکدام امید تیشۂ فکری توان زد تا گوہر معنی کہ سرمایۂ دکان خود فروشی باشد در کف آید و بچہ توقع طرح تاملی باید انداخت تا حسن عبارتی کہ نگاہ شوق را دیوانۂ شغل تماشا دارد رو نماید اگر فکر نظم دامن طبعیت می گریزد اندیشۂ تحصیل معاش نمیگذارد کہ نفسی آہ ماتم مردہ دلان ازین کسوت سربرآرد ۰۰۰"[1]

رسالہ حسن و عشق ـ

رسالہ حسن و عشق کے مصنف کا نام مرزا نورالدین محمد اور تخلص عالی تھا ـ آبائی وطن شیراز تھا ـ عالی کی ولادت ہندوستان میں ہوئی تھی ـ بچپن میں وہ

---

۱ ـ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصہ اول ، ص ٤

اپنے والد حکیم فتح الدین شیرازی کے ہمراہ شیراز گئے تھے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی تھی ۔ وہ اپنے زمانے کے مروجہ علوم میں دستگاہ رکھتے تھے ۔ شاہجہان کے عہد میں وہ ہندوستان واپس آئے اور شاہی ملازمت اختیار کرلی ۔[1] عہد عالمگیر میں انھیں شاہی مطبخ کا داروغہ مقرر کیا گیا اور نعمت خان خطاب عطا ہوا ۔[2] شاہی فوج کے ہمراہ وہ وقائع نگار کی حیثیت سے دکن گئے تھے ۔ ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۵ء میں جب اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کیا تو نعمت خان عالی نے مندرجہ ذیل قطعہ میں تاریخ کہی ۔

از نصرت پادشاہ غازی گردید دل جہانیان شاد
آمد بہ قلم حساب تاریخ شد فتح بجنگ حیدرآباد[3]

محاصرۂ گولکنڈہ کے وقت بھی وہ موجود تھے جس کے واقعات انھوں نے وقائع میں تحریر کئے ہیں ۔ نعمت خان کا خطاب ، جس سے وہ عام طور پر مشہور ہیں ، ملنے کے بعد انھیں مقرب خان کا خطاب بھی ملا ۔ معظم نے خوش ہوکر تین ہزاری منصب اور دانشمند خان کا خطاب بھی عنایت کیا ۔

عالی کو نظم و نثر دونوں میں یکساں طور پر قدرت حاصل تھی بالخصوص نثر نویسی میں وہ دستگاہ کامل رکھتے تھے ۔ عالی نے نظم و نثر دونوں میں کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ۔ دیوان کے علاوہ نثر میں وقائع نعمت خان عالی، جو وقائع حیدرآباد کے نام سے بھی مشہور ہوئے ، بہادر شاہ نامہ ، رقعات و منشورات کے علاوہ رسالہ حسن و عشق بھی شامل ہے ۔

عالی فارسی ادب میں اپنی طنز و ظرافت کے لئے مشہور ہیں ۔ ان کے معاصر امرا

---

۱ ۔ سرو آزاد ، ص ۱۳۶ ، خزانۂ عامرہ ص ۳۴۳
۲ ۔ ایضاً ص ۱۳۷
۳ ۔ ایضاً ص ۱۳۷ ، مآثر عالمگیری ، ص ۲۶۷

ان کے طنز و مزاح کے اکثر شکار ہوتے تھے اور ان سے خائف رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ انھوں نے شاہ زمان عالمگیر ، جو ان کے مربی بھی تھے ان کو بھی طنز و ہجو ملیح کا نشانہ بنایا ۔ ان کی وفات ۱۱۲۱ھ / ۱۷۰۹ء میں ہوئی ۔[1]

رسالہ حسن و عشق نثر میں چھبیس صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن اس کو ادبی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ حسن و عشق کی فرضی داستان ہے جو عالی کی طنز نگاری کا بہترین نمونہ ہے ۔ نثر کے درمیان کہیں کہیں اشعار بھی ملتے ہیں ۔ بظاہر یہ حسن و عشق کی داستان معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل مسائل تصوف کے اظہار کے لئے تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ عالی کا طنزنگار قلم فرضی روایت کے پردے میں اس زمانے کے سماج پر لطیف چوٹیں کرتا ہے ۔ اگرچہ حسن و عشق کے پرتکلف انداز بیان نے طنز کی تیزی ذرا کم کردی ہے پھر بھی اس کا تاثر بھرپور ہے ۔[2] تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بھی بکثرت کیا ہے ۔ چونکہ مشکل اور پرتکلف اور اسلوب نگارش اس دور کا مروجہ و پسندیدہ اسلوب خیال کیا جاتا تھا اس لئے مضمون کی رنگینی اور لطافت بیان کے باعث یہ رسالہ بہت جلد مقبول ہوگیا چنانچہ اس دور کے بعد تک نصاب تعلیم میں شامل رہا ۔

شرح حسن و عشق ۔

امام بخش صہبائی چونکہ اپنے زمانے کی مشکل تصانیف ، جو اس وقت کے نصاب تعلیم میں بھی شامل تھیں اور ان کی مشکل پسندی سے خوب واقف تھے اس لئے انھوں نے اس کی شرح لکھنے کی ضرورت کو سمجھا اور اس کی ذمہ داری کو خود قبول کیا ۔ فارسی کے شائقین بالخصوص اپنے فرزندوں اور شاگردوں کی آسانی کے لئے انھوں نے اس رسالہ کی شرح لکھی تھی ۔ یہ شرح ۱۲۵۱ھ / ۳۵-۱۸۳۴ء میں لکھی گئی جس کی تاریخ " یاد بادا شرح وصل حسن و عشق " سے نکلتی ہے ۔

---

۱ ۔ سرو آزاد ، ص ۱۳۷ ۲ ۔ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب ، ص ۴۲۹

صہبائی سے قبل اس کی شرح کسی نے نہیں لکھی تھی ۔ اس کے مطالب کی شرح لکھنے میں حسب سابق انھوں نے شرح نویسی کا پورا حق ادا کر دیا ہے ۔ سید عارف نوشاہی نے اپنی فہرست میں اس کا ذکر " نثر ہائے ادبی" کے ذیل میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

" شرح حسن و عشق ۔ از امام بخش صہبائی دہلوی (م ۱۲۷۳ھ) در ۱۲۵۰ھ بدان آغاز کردہ و در ۳ شعبان ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء بپایان رسانیدہ است ۔ تاریخ شروع تالیف از مصرعہ " یاد بادہ شرح وصل حسن و عشق " و از مادۂ " آغاز امر " بدست می آید ۔۔۔۔"[1]

اس کے علاوہ مولوی احمد حسین شوکت بھی اپنی تقریظ میں شرح حسن و عشق کے بارے میں کہتے ہیں کہ چونکہ نعمت خان عالی کی حسن و عشق ہندوستان کے مدارس کے نصاب میں شامل تھی اور اس کے کچھ مقامات انتہائی مشکل تھے پس مولانا صہبائی نے طالب علموں کے علم کی روشنی بڑھانے کے لئے اس کی شرح لکھی اور حسن و عشق کے مشکل مقامات کو اس طرح حل کیا کہ اس سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ نعمت خان عالی اپنی عبارت میں اکثر قرآنی آیات کا التزام انتہائی مناسب اور مہارت کے ساتھ کرتا ہے لہذا فارسی زبان کے طالب علم عرب کی زبان سمجھنے سے مجبور تھے ۔ چنانچہ صہبائی نے ان آیات کے معنی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اس طرح تحریر کئے کہ ایک معمولی طالب علم بھی اس کے مطالب کو آسانی سے سمجھ سکے ۔

یہ شرح گویا فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی فرہنگ ہے ۔ صہبائی نے اس کی شرح میں اس حد تک موشگافی اور باریک بینی سے کام لیا ہے کہ کوئی بھی صاحب فکر و دقیقہ سنج اس سے بہتر نہیں سوچ سکتا ۔ اگر نعمت خان عالی نے حسن و عشق لکھنے میں جادو بیانی سے کام لیا ہے تو صہبائی نے اس کی شرح لکھنے میں کمال دکھایا ہے ۔

---

۱ ۔ فہرست نسخہ ہای خطی ، ص ۴۳۰ سید عارف نوشاہی

سچ تو یہ ہے کہ حسن و عشق جیسے قصہ کی شرح لکھنے کے لئے صہبائی جیسے شارح کی ضرورت تھی ۔ صہبائی کی شرح حسن و عشق کے رخسار کے لئے مثل غازہ کے ہے اور حسن و عشق میں فصاحت و بلاغت اس شرح سے بڑھ جاتی ہے ۔ صہبائی نے جس طرح کتاب حسن و عشق کی مشکلات اور باریکیوں کو حل کیا ہے غالباً نعمت خان عالی بھی اس سے بہتر نہیں کرسکتے تھے ۔[1]

معمائے نصیرائے ہمدانی ۔

نام ابونصر نصیرالدین بن محمود اور تخلص نصیر تھا ۔[2] ظہیرائے تفرشی کے معاصر تھے ۔ تذکروں میں ان کا زیادہ حال نہیں ملتا ۔ شبنم شاداب کے مرتب محمد نعیم الرحمن ان کا سنہ ولادت ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء بتاتے ہیں ۔ ظہیرائے تفرشی کی طرح ان کی منشآت میں بھی شاہ عباس کے باغ کی تعریف ہے ۔ وہ معما گوئی میں ماہر اور ایک اچھے نثر نگار تھے ۔ نصیرائے ہمدانی سلطان جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ہندوستان بھی آئے تھے، پھر محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ جاکر مقیم ہوئے ۔ ان کے رقعات کو فارسی ادب میں کافی اہمیت حاصل ہے ۔ منشآت نصیرائے ہمدانی ان کی نثروں کا مجموعہ ہے، جس میں ان کے مکتوبات اور ان کی دیگر تصنیفات کے دیباچے بھی شامل ہیں ۔ ذیل میں مثال کے طور پر ان کی نثر کا ایک نمونہ دیا جارہا ہے جس میں انھوں نے باغ عباس آباد جدید کی تعریف و توصیف میں اپنے الفاظ کی کم مائیگی کا اظہار کیا ہے ۔

" نمی دانم کدام عبارت تازہ پیدا کنم و چہ مضمون رنگین بدست آرم، کہ بوسیلۂ آن دو سہ حرفی از خوبی ہای آن باغ و سرا بیان کنم تکلف نمی کنم، چندان کہ اصفہان انتخاب جہان است، این باغ

۱۔ کلیات صہبائی، جلد دوم حصہ دوم ص ۳۵۔۳۴ (تقاریظ) ۔ ۲۔

۲۔ آربری انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ص ۳۷۶، شبنم شاداب تقریب ص ل

و سرا انتخاب اصفهان ۰۰۰۰ سخت می ترسم که این گفتگو ها را حمل بر عبارت آرائی و سخن سازی فرمایند ـ به محبت قدیم و اشتیاق جدید سوگند ، که هیچ گونه اغراقی و هیچ مبالغه نرفته ـ طرف کوچك گفت و شنید محیط این بحر ژرف نتواند شد ، و لباس تنگ و کوتاه بست و نه حرف بر قامت این مضمون راست نیاید "[1]

شرح معمای نصیرای همدانی ـ

صهبائی کی لکھی ہوئی شرح کی نام سے مشہور ہے یعنی شرح معمای همدانی ، شرح نصیرای همدانی یا حل مقامات انشای نصیرای همدانی وغیرہ ـ یہ اکیاون صفحات پر مشتمل کلیات صہبائی کی جلد دوم (حصہ دوم) مین شامل ہے اور علحدہ سے بھی چھپی ہے ـ صہبائی نے دیباچہ کے بعد چھبیس صفحون کی تمہید مین معما کی تعریف اور اس کے اصولون کو تفصیل سے لکھنے کے بعد ان مقامات کی تشریح کی ہے جو معمے کے طور پر لکھے گئے تھے ـ یہ شرح انھون نے ۲۴۷ ھ / ۳۲ـ۱۸۳۱ء مین لکھی ـ کلیات صہبائی (جلد اول) مین صہبائی کی دو مختصر نثرین موسوم بہ " دیباچۂ تلخیص حل مقامات نصیرای همدانی " اور " خاتمۂ تلخیص حل مقامات نصیرای همدانی " ہین ـ ان سے پتہ چلتا ہے کہ صہبائی نے شرح معمای نصیرای همدانی کی تلخیص بھی کی تھی جو اب نایاب ہے ـ

اس مین شك نہین کہ فن معما ایك مشکل اور دقیق فن ہے ـ جب تك کوئی شخص اس کے قواعد و ضوابط سے واقف نہ ہو ، خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور صاحب علم و فضل کیون نہ ہو ، اس کی تہہ تك نہین پہنچ سکتا ـ صہبائی نے دوسری مشکل تصانیف کی شرح

۱ـ رقعہ بنام محمد ہادی ، منشآت نصیرای همدانی ، ص ٦٦ـ ٦٨

لکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ معموں کی شرح بھی لکھی تھیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف علم و فضل اور ذہن رسا کے مالک ہی نہ تھے بلکہ فن معما سے اپنی فطری دلچسپی کے سبب ، فن معما کے پورے قواعد و ضوابط سے واقفیت رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فن معما اور اس کی شروح لکھنے کے مشکل کام کا آغاز کیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوئے ۔

مولوی احمد حسین شوکت اپنی فارسی تقریظ میں اس شرح کی خوبیاں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

" ۔۔۔۔ صہبائی این عقدہ بناخن فکر رسا و بطبع حلال مشکلات آنچنان سہل نمودہ کہ نابینایان معانی بلا وساطت عصا بمنزل مقصود خواہند رسید ۔ صہبائی در مقدمۂ این شرح قواعد معما را آنچنان تشریح کردہ کہ متعلمان را در حل کردن معمات آسانیہا رو دادہ ۔ و سابق انچہ فن معما اشکل ترین فنون بنظر می آمد حالا رو با سہل ترین فنون نہادہ ۔ اعمال تعمیہ مثل تلمیح و توشیح و تالیف وغیرہ را آنچنان ضبط نمودہ کہ فن معمی مثل آئینہ رو نمودہ ۔ الحق کاری کردہ کہ کسی از مقدمین و متاخرین بجانب آن رجوع نفرمودہ ۔ این کتاب مبتدیان و منتہیان زبان فارسی را برای رخت بردن بمنزل مقصود مشعل توفیق ست و ذریعۂ تحقیق و تدقیق "۔[1]

معمائے منظوم جامی ۔

نورالدین عبدالرحمن جامی (۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء تا ۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء) اپنے

---

۱ ۔ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصہ دوم ، (تقاریظ) ص ۳۵ ، ۳۶

زمانے کے مشہور و معروف صوفی شاعر اور نثر نگار تھے ۔ جامی کی تصانیف کی تعداد بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق ان کے تخلص " جامی " کے اعداد (٥٤) کے برابر ہے ۔ جامی کے حالات زندگی کی تفصیل ہر تذکرہ میں موجود ہے اس لئے یہاں پر اس سے صرف نظر کیا جا رہا ہے ۔ جامی معما گوئی میں بھی استاد مانے جاتے تھے ۔ بقول آزاد فن معما میں ان کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں ہوا چنانچہ انھوں نے اس فن میں کئی رسالے لکھے ۔ ان میں ایک معمائے اصغر منظوم ہے جو معما پر ان کا آخری اور سب سے مختصر رسالہ ہے ۔ چونکہ صہبائی بھی فن معما گوئی کے دلدادہ تھے اور انھوں نے خود بھی فن معما پر چند رسالے لکھے تھے اس لئے انھوں نے مشہور معما گو جیسے نصیرائے ہمدانی اور جامی وغیرہ کے معموں کی شرحیں بھی لکھیں تھیں ۔

شرح معمائے جامی ۔

صہبائی کی یہ شرح اٹھائیس صفحات میں کلیات صہبائی (جلد دوم حصہ دوم) میں شامل ہے ۔ شرح کی ابتدا میں فن معما کی مختصر تعریف بیان کی ہے جیسا کہ وہ خود شرح کے دیباچے میں لکھتے ہیں ، یہ شرح انھوں نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر لکھی تھی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں پڑھے لکھے لوگوں میں معما گوئی کا ذوق و شوق پایا جاتا تھا ۔ " دویم شہر شعبان مبارک " سے ۲۵۱ھ / ۲۳ نومبر ۱۸۳۵ء یعنی اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے ۔

رسالہ عبد الواسع ہانسوی ۔

عبد الواسع ہانسوی کا شمار اٹھارویں صدی کے چند مشہور فارسی دانوں میں ہوتا تھا وہ فارسی زبان و ادب کے استاد تھے ۔ انھوں نے پینسٹھ ٦٥ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا تھا جس میں تین ابواب اور ایک مقدمہ شامل تھا ۔ اس رسالے میں

صرف و نحو ، لسانیات ، تحقیق الفاظ اور اہل زبان کی ادبی اصطلاحات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

حل مقامات عبد الواسع ہانسوی۔

جس وقت صہبائی اپنے طالب علمون کو پڑھاتے تھے تو ان کے شاگرد ان کے اشارات لکھ لیا کرتے تھے۔ کلیات صہبائی کے مولف منشی دین دیال نے ان اشارات کو یکجا کرکے مندرجہ ذیل عنوان سے کلیات مین شامل کر دیا۔

" حل بعض از مقامات رسالہ عبد الواسع ہانسوی از استادی مولانا صہبائی مدظلہ وقت سبق گرفتن افادہ شد "۔

یہ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

جواہر الحروف۔

فارسی کی مشہور لغت " بہار عجم " کے مصنف لالہ ٹیک چند بہار علم و فضل کے اعتبار سے اعلی مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد مین وہ موجود تھے۔ مشہور تذکرہ نگار خوشگو اور مشہور و معروف شاعر و نثر نگار خان آرزو کے دوستون مین سے تھے۔ ان کا ذکر بہت کم تذکرون مین ملتا ہے۔ خمخانۂ جاوید مین ہے۔ " لالہ ٹیک چند کھتری دہلوی " متخلص بہ بہار نظم و نثر فارسی مین فاضل کامل دقت پسند ، محاورات فارسی اور علم لغت مین ماہر ، رنگین طبع و خوش مزاج تھے"۔[1] بہار فارسی کے شاعر بھی تھے اور کبھی کبھی موقیہ اردو مین بھی شعر کہتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ ایران بھی گئے تھے۔

۱۔ خمخانۂ جاوید ، جلد اول ص ۶۱۲

بہار کا گرانبہا کارنامہ ان کی فارسی لغت " بہار عجم" ہے ۔ اس کو مرتب کرتے وقت الفاظ کی تحقیق میں انھوں نے بڑی جد و جہد کی تھی اس کے لئے انھوں نے ایک بار ایران کا سفر بھی کیا تھا ۔ " بہار عجم " کو تالیف کرتے وقت انھیں کچھ ایسے نکات بھی ملے جو " بہار عجم " میں شامل نہیں کئے جا سکتے تھے لیکن اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ان نکات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جس کا نام انھوں نے " جواہر الحروف " رکھا ۔ اس میں حروف تہجی کے خواص بتائے گئے ہیں یعنی ان کے وہ فوائد جو اساتذہ نے بتائے تھے یا انھوں نے خود معلوم کئے تھے ۔

حل مقامات نسخۂ جواہر الحروف ۔

صہبائی نے اس رسالہ کی شرح " حل مقامات نسخۂ جواہر الحروف اور شرح مختصر جواہر الحروف " کے نام سے لکھی ۔ یہ دونوں رسالے اب دستیاب نہیں اور نہ ہی کلیات صہبائی میں شامل ہیں البتہ ان کے دیباچے کلیات صہبائی (جلد اول) میں ضرور شامل ہیں ۔

صہبائی کی شروح کی ادبی و لسانی خصوصیات ۔

اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صہبائی نے جتنی متون کی شروح لکھی ہیں ، وہ انتہائی محنت ، لگن اور جستجو کے بعد لکھی ہیں ۔ ان شروح کے لکھنے میں انھوں نے اپنا زور قلم صرف کر دیا ہے اور ان مایۂ ناز شاہکاروں کی شروح ان کے علم و فضل نیز فکر عمیق کی آئینہ دار ہیں ۔

بطور مجموعی صہبائی کی تصنیف کردہ شروح میں مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں ہیں جو ان کے علم و فضل اور دقت فکر و نظر کی عکاس بھی ہیں ۔

۱۔ صہبائی شرح نویسی کے وقت متن کے مستند ہونے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس مقصد کے تحت وہ شرح لکھنے سے قبل متن کی مختلف نسخوں کی مدد سے تصحیح کرکے، نسخے کے مستند ہونے کا یقین کرلیا کرتے تھے۔ اور جہاں کہیں اختلاف نظر آتا یا کاتب کی غلطی سے کسی لفظ یا حرف میں اشتباہ پایا جاتا، وہ خود اس کی تصحیح بھی کردیتے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ شرح کا آغاز کرتے تھے۔ کسی بھی متن کی تصحیح کرنا آسان کام نہیں اس کے لئے علمی و ادبی صلاحیت نیز ذہانت کا ہونا لازمی چیز ہے۔ بلاشبہ صہبائی جیسے صاحب علم و فراست شخص ہی اس مشکل کام کو خوش اسلوبی سے کرسکتے تھے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ متن کی شرح لکھنے سے قبل وہ ایک حد تک اسکی تدوین بھی کرلیا کرتے تھے۔

۲۔ شروح میں متن کے ایک جملے یا ایک لفظ کا مطلب بھی بغیر تحقیق یا کسی حوالے کے نہیں لکھا گیا۔

چونکہ صہبائی کی تشریح کردہ متون زیادہ تر "سبک ہندی" کی نمایندہ اور مشہور تصانیف تھیں جو اپنی مشکل گوئی اور دقت پسندی کے لئے مشہور تھیں۔ مشکل پسندی سے مطلب صنائع و بدایع کا بکثرت استعمال اور ترکیبات و محاورات وغیرہ کی زیادتی ہوتا تھا۔ چونکہ صہبائی کو علم بدیع، قواعد و عروض وغیرہ پر قدرت حاصل تھی اور فارسی زبان کی ترکیبات و محاورات سے بھی وہ بخوبی واقف تھے اس لئے اپنی شروح میں وہ متن کا ایک ایک جملہ لے کر اس کے سب اجزائے ترکیبی اور اس کی لغوی و نحوی مشکلات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی بات کو مدلل بنانے کی غرض سے اساتذہ کے اشعار سے شواہد بھی پیش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ترکیب یا محاورے کا استعمال بتانے کے لئے کئی اساتذہ کے اشعار و اقوال سے مثالیں بھی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی متن کے ایک جملے کا مطلب کئی صفحات میں آیا ہے، یہ امر ان کی قابلیت اور علم و فضل کا آئینہ دار ہے۔

۵۔ صہبائی نے اپنی شروح میں قرآن اور حدیث کی تلمیحات کو انتہائی وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ متون میں جہاں کہیں قرآن اور حدیث کی تلمیحات آئی ہیں انہوں نے ان کی توضیح و تشریح میں کوئی کثر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ دراصل فارسی زبان کے ساتھ وہ عربی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے اس لئے انہیں اس قسم کی تلمیحات کی وضاحت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

۶۔ معما گوئی جیسے مشکل علم سے بھی صہبائی کماحقہ واقف تھے چنانچہ معمون کی شرح لکھتے وقت بھی ان کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ انہوں نے فن معما کی تعریف اور اس کے اصولوں کی وضاحت مع مثالوں کے اس طرح کی ہے کہ معما کے اصولوں سے ناواقف شخص کے لئے بھی اس کا سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شرح نویسی کا مقصد ہوتا بھی یہی ہے۔ چنانچہ اگر دیکھا جائے تو شرح نویسی کا کام مصنف کے کام سے کم اہم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک جگہ سہ نثر کے دیباچہ میں وہ خود کہتے ہیں کہ " مبصران باریک بین " اگر دیدۂ انصاف سے دیکھیں گے تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شرح لکھنے میں انہوں نے مصنف کی دقت فکر سے کم کام نہیں کیا ہے۔

۷۔ شروح کی زبان صہبائی کی دیگر ادبی تصانیف کے مقابلے میں آسان اور سہل ہے۔ اس بات کا لحاظ انہوں نے اپنی شروح میں رکھا ہے کہ ایک عام قاری یا طالب علم ان شروح اور ان کے نکات کو بآسانی سمجھ سکے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے روایتی اسلوب نگارش سے ذرا ہٹ کر نسبتاً سادہ اور آسان زبان میں شروح لکھی ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ان شروح کی ایک نمایاں خصوصیت سادگیٔ بیان و زبان بھی ہے۔

مثال کے طور پر سہ نثر کی پہلی نثر (دیباچۂ نورس) کے پہلے جملے
" سرود سرایان عشرتکدۂ قال کہ بنورس سرا بستان حال کار کام و زبان ساختہ
بشہد ثنای صانعی عذب البیان اند کہ جاشنی نغمہای شکر در رگ و پی نی
دوانیدہ " کی تشریح صہبائی نے ۱۳۳ سطرون (سات صفحات) پر کی ہے ۔[1]
الفاظ کے معنی و مطالب کو بیان کرنے اور تراکیب کا استعمال بتانے کی غرض سے
مشہور استاد شعرا جیسے سعدی ، رومی ، شریف تبریزی ، نظامی وغیرہ کے
اشعار سے امثال پیش کی ہین ۔

۳۔ شروح مین جن الفاظ و لغات کا استعمال کیا گیا ہے ان کے حوالے بھی دئے ہین
ایک ایک لفظ کے لئے کئی کئی لغات کو استعمال کیا گیا ہے یعنی ان کی شروح
مین حوالون اور ماخذ کا خاص خیال رکھا گیا جو تحقیق کا بنیادی اصول ہے ۔
شرح لکھنے کے ساتھ ساتھ انھون نے ایک محقق کا فرض بھی بخوبی نبھایا ہے ۔
ان حالات کی روشنی مین کہا جاسکتا ہے کہ صہبائی کی شروح کی ایک نمایان خصوصیت
ان کا معتبر اور مستند ہونا بھی ہے ۔

٤۔ اکثر متون مین موسیقی اور نجوم کی اصطلاحات آئی ہین ۔ ان کی تشریح بھی
صہبائی نے اسی دقت و کاوش سے کی ہے جس طرح کہ دوسرے مشکل مقامات کی ۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم نجوم اور موسیقی کی اصطلاحات سے بھی کافی حد تک
واقفیت رکھتے تھے ۔ یا شرح لکھنے سے قبل ضرورت کے تحت وہ اس قسم کے علوم
کے بارے مین بھی تفصیل حاصل کرلیتے تھے تاکہ شرح لکھتے وقت کسی طرح کی
غلطی نہ ہونے پائے ۔ یہ امر ان کی احتیاط پسند طبعیت اور دقت فکر
پر دلالت کرتا ہے ۔

۱۔ کلیات صہبائی ، جلد دوم حصہ اول ، ص ۳
۲۔ ایضاً ص ۳ تا ۱۰

ظہوری اور صہبائی ۔

جیسا کہ پچھلے ابواب مین لکھا جا چکا ہے کہ مغل دور کی ابتدا سے لے کر زوال مغلیہ تک کا عہد ادبی اعتبار سے " سبک ہندی " کہلاتا ہے ۔ جتنے فارسی شاعر اور ادیب ہندوستان مین پیدا ہوئے یا باہر سے آکر یہان سکونت اختیار کرلی وہ سب " سبک ہندی " کے اختیار کرنے والے تھے ۔ " سبک ہندی " کے ماننے والے صرف شاعر حضرات ہی نہین تھے بلکہ اس عہد کے نثر نگار بھی اپنی نثری نگارشات مین سبک ہندی کی خصوصیات کو برتتے تھے اور نثر نگاری مین دقیقہ سنجی ، دقت پسندی مبالغہ آرائی ، مضمون آفرینی ، تشبیہ و استعارہ اور ابہام جیسی خصوصیات کا استعمال بکثرت کرتے تھے ۔ اس دور کے ادب کی خصوصیات مین سب سے زیادہ عنصر تصنع کا ہے ۔ نہ صرف خیال بلکہ زبان مین بھی تصنع پایا جاتا تھا ۔ چنانچہ اس عہد کی فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر بھی مسجع و مقفی ہوتی تھی اور اس مین مشکل زبان کا استعمال بدرجۂ اتم کیا جاتا تھا ۔ سہ نثر ظہوری ، رقعات بیدل ، انشائے ملا طاہر وحید ، انشائے مادھورام وغیرہ اس طرز نثر نگاری کی نمایندہ اور بین مثالین ہین ۔ ان تصانیف مین سر فہرست سہ نثر ظہوری کا نام آتا ہے ۔ جیسا کہ خود ظہوری کی نثری تصنیف سہ نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور کے مشہور اور اہم شاعر و ادیب تھے ۔ چنانچہ دوسرے شاعرون اور ادیبون کے علاوہ صہبائی بھی ، جو اپنے زمانے کے فارسی کے قابل اور ماہر ہوئے استاد سمجھے جاتے تھے ، ظہوری کی طرز تحریر سے متاثر نظر آتے ہین ۔

صہبائی نے نہ صرف ظہوری کی " سہ نثر " کی شرح لکھی بلکہ اس کی طرز پر اپنی ایک کتاب بنام " ریزۂ جواہر " بھی لکھی جس کا انداز بالکل " سہ نثر " سے

ملتا جلتا ہے ۔

صہبائی کی نثری تصانیف میں " ریزۂ جواہر " کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ کیونکہ یہ نثر " سہ نثر " ظہوری کی تقلید میں اسی کے طرز پر لکھی گئی تھی اس لئے اس کے ہر ہر فقرے اور عبارت پر ظہوری کی انشا پردازی اور اس کے اسلوب تحریر کا اثر صاف پایا جاتا ہے ۔ " ریزہ جواہر " کو صہبائی کا اہم ترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے ۔ صہبائی کی ادبی تصنیف " ریزۂ جواہر " کا تفصیلی جائزہ قبلاً لیا جاچکا ہے جس میں ظہوری کی سہ نثر سے اس کی مماثلت و مشابہت پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی ۔ اور بتایا گیا تھا کہ صہبائی ظہوری کے انداز تحریر سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں تحریر " ریزۂ جواہر " میں اس کو بعینہ اپنا لیتے ہیں ۔ چنانچہ صہبائی کی تحریر کا انداز بھی وہی مرصع ، مسجع و مقفی انداز تحریر ہے جو کہ ظہوری کا تھا ۔

چونکہ قبلاً اس بابت تفصیلی بحث کی جاچکی ہے اس لئے یہاں پر مختصراً اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ صہبائی کے بیشتر نثری مضمون یا تخلیقات پر ملا ظہوری کے انداز کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے ۔ اگر ان کی نثر نگاری کے متفرق اور مختلف نثر کے نمونے جیسے دیباچے ، خواتیم ، تقاریظ اور رقعات وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی بیشتر ظہوری کے انداز کی تقلید و نقل واضح طور پر نظر آئے گی ۔ اس خیال و رائے کی وضاحت کے لئے ذیل میں ان کی نثر کی چند مشترک خصوصیات بیان کی جارہی ہیں ۔

۱ ۔ ظہوری اور صہبائی دونوں کی تحریروں میں صنعت سجع کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔

۲ ۔ نہ صرف صنعت سجع کا استعمال بلکہ اپنے ممدوحین کی تعریف و ستائش میں

دونون انشا پرداز لفظی اور معنوی رعایتون کا استعمال بھی بڑی خوبی اور قادرالکلامی سے کرتے ھین ۔

۳۔ دونون نثر نگارون کے وھان نثری حصون کے بعد مثنوی کے اشعار یا قطعہ یا رباعی ضرور ملتی ھے ۔

٤۔ دونون انشا پردازون کے یہان طویل جملون کا استعمال بھی تحریر کی خوبی سمجھا گیا ھے ۔

٥۔ ظہوری کے اتباع مین نئی نئی تراکیب اور نئے فقرات کی ایجاد و اختراع بھی صہبائی کے وھان ھم کو نظر آتی ھے ۔

٦۔ دونون کی نثر مین موضوع سخن اور خیالات کی یکسانی کے ساتھ ساتھ ان کی ھئیت مین بھی مماثلت پائی جاتی ھے ۔

دونون انشا پردازون کی نثرون کو بغور پڑھنے کے بعد ایک ذی فہم قاری اس بات سے انکار نہین کرسکتا کہ دونون نے اپنی اپنی قوت و استعداد کے مطابق داد سخن دی ھے ۔ ظہوری اگر اھل زبان اور استاد فن ھین تو صہبائی بھی قدرت کلام اور لطف بیان مین ان سے کم نہین ۔ چونکہ قبلاً " ریزۂ جواھر " کے ضمن مین دونون کی نثر سے مثالین پیش کی جاچکی ھین اس لئے یہان پر صرف نظر کیا جارھا ھے ۔

شرح سہ نثر کے ضمن مین "سہ نثر" اور اس کی شرح کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاچکی ھے ۔ اب مزید تفصیل کی نہ گنجائش ھے اور نہ ضرورت لہذا مختصراً " سہ نثر کی شرح سے ایک دو مثالین پیش کی جارھی ھین جن سے صہبائی کی شرح نویسی کی نمایان خصوصیات ابھر کر سامنے آسکین گی ۔

چونکہ سہ نثر ظہوری " سبک ھندی " کی نمایندہ اور ظہوری کی شاھکار تصنیف تصور کی جاتی تھی اس لئے اس کی شرح لکھنا آسان نہ تھا ۔ اگرچہ صہبائی سے قبل بھی

مختلف اہل قلم حضرات اس کی شرح لکھ چکے تھے لیکن صہبائی کی عالمانہ بصیرت اور دقیقہ سنج فطرت کسی ایک سے بھی مطمئن نہ ہوسکی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے خود اس کی شرح لکھی اور اس میں شک نہیں کہ سہ نثر کی شرح لکھتے ہوئے انھوں نے تحقیق اور شرح نویسی کا پورا حق ادا کر دیا ۔ کبھی کبھی تو ایک جملے کی شرح لکھنے میں کئی کئی صفحات تحریر کر دئے ہیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی لغات اور اساتذہ کے کلام سے اپنے مطلب کو واضح بھی کیا ہے ۔ مثال کے طور پر سہ نثر کا ایک شعر ہے

بضبط نغمۂ اسرار پرداخت

ز صندوق تن خلق ارغنون ساخت[1]

اس کی شرح میں صہبائی لکھتے ہیں کہ ضبط بالفتح کا مطلب نگاہ داشتن ہے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب حق تعالی نے ارادہ کیا کہ اپنے اسرار کے نغموں کو انتشار سے بچالے اور کسی ایک جگہ اس کی حفاظت کرے تو اس نے صندوق سے جو مخلوق کے جسم سے عبارت ہے ، ارغنون بنایا ۔ ارغنون سازی کیا ہے ۔ ایک صندوق جس میں مختلف ساز ہوتے ہیں اور جب اس پر ضرب لگاتے ہیں تو مختلف آوازیں نکلتی ہیں ۔ فی الحال وہ فرنگیوں کی صنعت سے مشہور ہے اور اس کو آرگن فارسی کے کاف کے ساتھ بولتے ہیں ، لیکن وہ فارسی میں غین کے ساتھ مستعمل ہے ۔ یعنی ارغن ، اور لفظ ارغن ارغنون کا مخفف ہے اور اس زمانے میں غین کاف سے بدل گیا ہے ۔ لغت میں اس کے بارے میں دوسری تفصیلات بھی ملتی ہیں جسکی یہاں پر ضرورت نہیں ۔ اس شعر کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا جسم جو غیرمتناہی اسرار و آثار کا مظہر ہے خدا تعالی کا بنایا ہوا ارغنون ہے (یعنی ساز کے مانند ہے جس سے خدا تعالی کے اسرار کا اظہار ہوتا ہے) لہذا کوئی راز ایسا نہیں ہے جو انسان کی ذات میں تصور نہ کیا جاسکتا ہو۔[2]

۱۔ کلیات صہبائی ، جلد دوم ، حصہ اول ، ص ۱۸

۲۔ ایضاً

ایک اور جگہ سہ نثر ظہوری کے ایک جملے " ز تیغش پیکر خصمان دو پیکر ـ ز گرزش فرقہا را سینہ مغفر " کی شرح میں لکھتے ہیں ـ دو پیکر ہوجانا یعنی دو حصے ہوجانا اور مغفر شدن سینہ کنایہ ہے یعنی گرز کے صدمہ سے سر سینہ کے اندر چلا گیا اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دو پیکر برج جوزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہنے کا مقصد ممدوح کی تلوار کی تیزی کا کمال بتانا ہے ـ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جوزا دو جڑواں بچوں کے مثل ہوتا ہے لہذا ہر دو، ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں ـ اس سے تلوار کی تیزی کا کمال و ہاتھ کی صفائی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو آدھے حصوں میں کاٹ بھی دیتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں ہوتے ـ پس جملے کا حسن یہ ہے کہ ممدوح کی تیغ بسبب اپنی تیزی اور چابکدستی کے دشمن کے جسم کے دو ٹکڑے کردیتی ہے یعنی تلوار دشمن کے بدن سے اتنی سبک ہوکر گزرتی ہے کہ جسم کے دونوں حصے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل جدا بھی نہیں ہوتے[1] ـ

---

۱ ـ کلیات صہبائی ، جلد اول ، حصہ دوم ، ص ۳٤

باب پنجم

اختتامیه

اختتامیہ

صہبائی کے فارسی کلام اور فارسی نثر پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد اردو زبان سے ان کی دلچسپی اور اس زبان میں ان کی چند کاوشیں کو یکسر نظرانداز کردینا مناسب نہیں ۔ اگرچہ اردو زبان میں ان کی تصانیف موضوع بحث نہیں پھر بھی مختصراً ان کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صہبائی فارسی زبان و ادب کے بے حد شائق و دلدادہ تھے ۔ وہ نہ صرف فارسی زبان و قواعد پر عبور رکھتے تھے بلکہ فارسی ادب کا بھی انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ اس کی وجہ کچھ تو ان کا طبعی میلان تھا اور کچھ اس دور میں فارسی زبان و ادب کی روایت تھی ۔ کہا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر تو وہ فارسی زبان و ادب کے شاعر اور نثر نگار ہی تھے لیکن ضرورتاً یا کسی کی فرمائش یا حکم پر وہ اردو زبان میں بھی بخوبی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ باالفاظ دیگر فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی ان کو کامل قدرت حاصل تھی ۔ اور کیوں نہ ہوتی اردو ان کی مادری زبان تھی ۔ چنانچہ دلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوتروس کی فرمائش پر انھوں نے دو تین کتابیں اردو زبان میں بھی لکھی تھیں ۔

۱۔ صہبائی نے پرنسپل بوتروس کے حکم پر حدائق البلاغت کا اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ حدایق البلاغت صنائع اور بدایع پر لکھی گئی ایک مشہور کتاب ہے جس کے مصنف شمس الدین فقیر تھے ۔ مسٹر بوتروس کا تقرر کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ۱۸۴۱ء میں ہوا تھا ۔ ۱۸۴۳ء میں انھوں نے دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی تھی جس کی نگرانی میں کتابیں اردو زبان میں ترجمہ کی جاتی تھیں اور

طبع ہوتی تھین ۔ چنانچہ مسٹر بوتروس کی خواہش پر صہبائی نے صرف اس کا لفظی ترجمہ ہی نہین کیا بلکہ اس کے مطالب کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اور جہان جہان ضرورت محسوس کی ہے وہان پر کچھ اضافے بھی کردئے ہین جیسے شمس الدین فقیر نے اپنی کتاب مین شعر کی تعریف صرف تین سطرون مین بیان کی تھی ، صہبائی نے ترجمہ مین اس کا مطلب تین صفحون پر لکھا ہے ۔ دراصل اس طرح انھون نے اپنی کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید اور عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ حدایق البلاغت کی ابتدا ایک شعر سے کرتے ہوئے لکھتے ہین ۔۔

" مقدور ہمین کب ترے وصفون کی رقم کا

حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

۔۔۔۔۔ حدایق البلاغت علم بیان و بدیع اور عروض مین شمس الدین فقیر رحمہ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ ہے اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب مین شہرہ ہے ۔۔۔۔ اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبعلم کو فائدہ تام حاصل ہو اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کردئے اور از بسکہ لفظ لفظ کے ترجمے مین مطلب کی توضیح خوب نہین ہوتی اس لئے ترجمہ مین اس امر کا مقید نہین ہوا ۔۔۔۔ "[1]

ترجمہ کے آخر مین لکھتے ہین ۔۔

" مترجم فقط کتاب کے اصل مطلب پر قانع نہین ہوا بلکہ جس مقام مین سوا اس کے اور مطلب مناسب پائے ہین اس مین زیادہ کردئے ہین اور چند جائے ایسا بھی ہوا ہے کہ جو ترتیب مصنف کی اپنی رائے ناقص مین پسند نہین آئی اس کو تغیر دے کر اور ترتیب سے لکھا ہے "۔[2]

۱۔ حدایق البلاغت (ترجمہ) ص ۳۴ ، ۲ ، ۳

۲۔ ایضاً ص ۱۹۲

صہبائی نے حدایق البلاغت کا ترجمہ ۱۸۴۲ء مطابق ۱۲۵۸ھ مین کیا تھا ۔

۲۔ انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو ۔

صہبائی کا تالیف کردہ یہ ایک تذکرہ ہے جس مین چند منتخب شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا انتخاب شامل ہے ۔ یہ شعرا کا انتخاب بھی صہبائی نے پرنسپل بوتروس کی فرمائش پر دہلی کالج ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے کیا تھا ۔ انتخاب دواوین کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ نام کسی اہل زبان کا رکھا ہوا نہین ہے ۔ پرنسپل بوتروس اردو زبان کی ترقی مین خاص دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ انھین کے ایما پر صہبائی نے یہ تذکرہ ترتیب دیا تھا ۔ انتخاب دواوین مین ولی ، درد ، سودا ، میر ، جرأت ، حسن ، نصیر ، ممنون ، ناسخ ، مول چند ، ذوق اور مومن کے کلام کا انتخاب شامل ہے اس کے ساتھ ہی ہر شاعر کے کچھ حالات بھی تحریر کئے گئے ہین ۔ ابتدا مین تقریباً تئیس صفحات کا مقدمہ ہے جس مین اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف سخن پر تبصرہ ہے ۔ اس تذکرے مین اس عہد کے چند دوسرے مشہور سخنور جیسے مصحفی ، انشا ، آبرو ، احسان اور غالب وغیرہ کا ذکر نہین ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاعرون کے انتخاب مین پرنسپل بوتروس کا یقیناً ہاتھ رہا ہوگا ۔ اردو زبان سے کم واقفیت کے سبب وہ ان شاعرون کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ نہ کرسکے ہونگے ۔ غالب کے نظر انداز کئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت تک یعنی اس تذکرے کی ترتیب کے وقت وہ ریختہ تقریباً ترک کرچکے تھے ۔ اور خود کو فارسی زبان کا شاعر کہلانے مین فخر محسوس کرتے تھے اور اس کے برخلاف ریختہ کے کلام کو "بیرنگ" قرار دیتے تھے ۔ غالب بھی اس وقت اپنے اردو شاعر کی حیثیت سے نظر انداز کئے جانے کی کچھ پرواہ نہین کرتے تھے کیونکہ اس وقت

ریختہ گوئی میں نام پیدا کرنا ان کے نزدیک کوئی قابل فخر بات نہ تھی ۔ اگر ان کو اس انتخاب میں منتخب نہ کئے جانے پر کوئی شکوہ ہوتا تو کہیں نہ کہیں ان کے کلام یا مکتوب میں اس کا ذکر ضرور ہوتا ۔ اگر بوتروس احب نے غالب کو اپنے تذکرے میں شامل نہیں کیا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ۔ ایک دوسرا فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی بھی جو اپنے زمانے کی اردو پر متعلق ایک ایک چیز کا ذکر کرتا ہے ، غالب کا ذکر وہ بھی صرف ایک دو جملہ اختصار کے ساتھ ہی کرتا ہے اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس وقت وہ اردو سے زیادہ فارسی کے شاعر سمجھے جاتے تھے اور وہ خود بھی اپنے فارسی کے شاعر ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے ۔ دوسری وجہ غیر ملکی اردو زبان دانوں (مستشرقین) کی ناواقفیت اور ناقدر شناسی بھی کہی جاسکتی ہے ۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے معیار پر اہل زبان کا کلام پورا نہ اترتا ہو کیونکہ وہ اپنی رائے کے مطابق اس کو پرکھتے اور اس کی قدر کرتے تھے

انتخاب دواوین ۲۷۳ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۲۶۰ ھ / ۱۸۴۴ء میں اسے مرتب کیا گیا تھا ۔ یہ کلیات میں شامل نہیں اور اب نایاب ہے ۔

مولانا صہبائی کے " انتخاب دواوین پر ظہیر احمد صدیقی صاحب کا ایک مضمون مجلہ غالب نامہ میں ملتا ہے جس میں اس پر کافی تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اسکے علاوہ حال ہی میں " انتخاب دواوین کا نیا ایڈیشن جس کو تنویر احمد علوی نے مرتب کیا ہے راقم الحروف کی نظر سے گزرا ۔ ناچیز کی رائے میں انھوں نے صہبائی کا یہ غیر معروف تذکرہ مرتب کرکے صہبائی کو فارسی ادب کی دنیا میں روشناس کرانے کے لئے ایک خوش آیند قدم اٹھایا ہے ۔ تنویر احمد علوی اپنے دیباچے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ انتخاب بہت کمیاب ہے ۔

اس کا ایک نسخہ جس کا سرورق موجود نہیں نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے۔ ایک اور مکمل نسخہ ڈاکٹر فرقان فتحپوری کے بیان کے مطابق ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ذاتی ذخیرہ کتب کے ساتھ اس لائبریری کو منتقل ہوا ہے۔[1] پھر وہ لکھتے ہیں کہ ایک نسخہ جس سے انھوں نے استفادہ کیا ہے عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اور غالباً وہ ہندوستان میں موجود واحد قلمی نسخہ ہے۔[2]

۳۔ قواعد صرف و نحو اردو۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ میں دہلی میں طبع ہوئی۔ یہ ۲۳۹ صفحات پر کلیات مہیائی (حصہ دوم جلد ثانی) میں شامل ہے۔ دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی پرنسپل بوتروس کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ انھیں کی ہدایت کے مطابق کتاب کے آخر میں اردو زبان کے چند محاورے اور اصطلاحیں بھی اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں جو روز مرہ میں شامل ہیں۔ مقدمہ میں اردو زبان کا آغاز اور اس کی تفصیل بھی ہے۔ اگرچہ یہ تالیف انھوں نے پرنسپل صاحب کے کہنے پر لکھی تھی لیکن اس سے اردو زبان میں ان کی مہارت، صلاحیت اور اردو زبان سے ان کی دلچسپی کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت کی روایت اور روش کے مطابق وہ فارسی زبان میں بیشتر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے ورنہ اگر وہ چاہتے تو اردو زبان میں شعر کہنا یا نثر لکھنا ان کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ یہ امر باعث حیرت نہیں کہ انھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی کچھ آثار چھوڑے ہیں اگرچہ وہ تعداد میں زیادہ نہیں بلکہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اردو کی کتابوں میں ان کی زبان فارسی کے برعکس نہایت

۱۔ انتخاب دواوین، (دیباچہ) ص ۲۳
۲۔ ایضاً

صاف، سلیس اور سادہ ہیں۔ قواعد زبان و اردو اور انتخاب شعرائے اردو دونوں کتابوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ البتہ اردو کی دو تصانیف جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صہبائی کی لکھی ہوئی ہیں یعنی "آثار الصنادید" کے کچھ حصے اور مرزا قادر بخش صابر تلمیذ صہبائی کی "گلستان سخن" ۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں کی طرز تحریر صہبائی کی طرز تحریر سے کافی مشابہ ہے۔

آثار الصنادید ۔ حالی اور شبلی کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آثار الصنادید کے کچھ حصے امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں۔ بقول حالی ۔

"آثار الصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے"۔[1]

شبلی کا کہنا ہے ۔

"سرسید نے خود مجھ سے بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دئے تھے"۔[2]

ایک اور جگہ شبلی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں ۔

"۔۔۔۔آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور لہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔۔۔۔اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانا موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے، کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔۔۔۔"۔[3]

۱۔ حیات جاوید حصہ دوم، ص ۳۵۷
۲۔ مقالات شبلی، جلد دوم، ص ۵۸
۳۔ مقالات شبلی، جلد دوم، ص ۵۸

آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب میں ظہوری اور بیدل کی انشا پردازی کی جھلک ملتی ہے اور چونکہ صہبائی ظہوری اور بیدل کی طرز کے مقلد تھے اس لئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ آثار الصنادید میں کہیں کہیں بالخصوص اس کا چوتھا باب صہبائی کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہے۔ سرسید اور صہبائی کی دوستی اس امر کو اور تقویت پہنچاتی ہے۔

گلستان سخن ـــــ گلستان سخن شعرائے اردو کا ایک عام تذکرہ ہے۔ مرزا قادر بخش صابر جو صہبائی کے شاگرد تھے اس تذکرے کے مولف تھے۔ یہ تذکرہ پہلی بار دہلی میں ۱۸۵۵ء میں چھپا تھا۔ اس تذکرے میں مرزا قادر بخش اپنے استاد صہبائی کے لئے جن الفاظ اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے بہت بڑے ارادت مندوں میں سے تھے یقیناً " اس کی تالیف کے دوران وہ اپنے استاد سے مشورے اور اصلاح لیتے رہے ہونگے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں مگر اس کی طرز نگارش جو کافی حد تک صہبائی کی طرز نگارش سے مشابہ ہے اکثر اہل قلم کی رائے ہے کہ وہ صہبائی کی ہی طراوش قلم کا نتیجہ ہے اور مرزا صابر کے نام سے مشہور ہے چنانچہ اس تذکرے کے بارے میں محمد ذکاءاللہ دہلوی کا خیال ہے ـــــ " صہبائی نے تذکرۂ گلستان سخن لکھا ہے جو مرزا صابر کی تصنیف سے مشہور ہوا اور چھپا "۔[1] لالہ سری رام کی رائے ہے ـــ

" گلستان سخن ..... کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا "۔[2]

غالب نواب انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں " صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری ملک میں سے میرے پاس تھی ، وہ میں اپنی طرف سے بہ سبیل ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں "۔[3] یہ ۱۸۵۶ء کی بات ہے جب صہبائی حیات تھے۔ غالباً "

۱۔ خمخانۂ جاوید ، جلد اول ، (تقاریظ) ص ٤٦

۲۔ ایضاً " دیباچہ ص ۳

صہبائی کے تذکرے سے مراد یہاں گلستان سخن ہی ہے۔ اگر گلستان سخن کو صہبائی کی تصنیف مان لیا جائے تو گلستان سخن اور آثار الصنادید، دونوں میں کسی حد تک انشا پردازی کی جھلک نظر آتی ہے جو صہبائی کی طرز تحریر کے عین مطابق ہے۔

اردو میں ان کی مندرجہ بالا تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور قادر الکلام انشا پرداز کی طرح وہ دونوں قسم کی نثر نگاری پر قدرت رکھتے تھے یعنی سادہ نثر اور مرصع و مسجع یعنی مصنوع نثر۔ اس کے برخلاف فارسی زبان میں ان کا اسلوب تحریر مشکل پسندی اور مصنوع تحریر پر ہی مبنی تھا جو سبک ہندی کی طرز کی نمایندگی کرتا ہے اور تقریباً ان کی ہر فارسی تصنیف میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کے یہ دو مختلف پہلو تھے جو فارسی اور اردو زبان دونوں میں الگ الگ نمایاں تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر صہبائی فارسی زبان کی طرح اردو زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے اور اس زبان میں ان کی چند یادگار تحریریں بھی ملتی ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو زبان میں انھوں نے شعر نہ کہے ہوں جبکہ اردو زبان میں شعر کہنے والے بہت سے شعرا ان کے شاگرد بھی تھے اور ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اگرچہ کہا یہ جاتا ہے کہ فارسی کے علاوہ انھوں نے اردو زبان میں شاعری نہیں کی اس اعتبار سے یہ صحیح بھی ہے کیونکہ فارسی کی طرح انھوں نے باقاعدہ اردو میں شاعری نہیں کی تھی لیکن حسب ضرورت انھوں نے چند اشعار اردو میں ضرور کہے ہیں۔ مثال کے طور پر حدائق البلاغت کا ترجمہ کرتے وقت جہاں جہاں متال کے اور پر انھوں نے اردو کے اشعار لکھے ہیں وہاں ان کے شاعر کا نام ضرور لکھ دیا ہے۔ البتہ حدائق البلاغت میں چند اشعار ایسے بھی ہیں (اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں) جہاں کسی شاعر کا نام تحریر نہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اشعار

صہبائی کی ہی ابع موزون کا نتیجہ ہین ۔ قاضی عبد الودود صاحب کا خیال ہے کہ انھون نے جو اشعار حدیقۃ البلاغت کے ترجمے مین صنائع کے امثال مین دئے ہین ان کے کہے ہوئے ہین کیونکہ کئی اشعار ایسے ہین جن کے ساتھ کسی شاعر کا نام بھی نہین دیا ہے اور وہ کہین نثر سے بھی نہین ماخوذ ہین ۔[1]

اس کے علاوہ " بحرالفصاحت " کے مصنف نجم الغنی نے اپنے تصنیف مین مثال کے طور پر جو اشعار لکھے ہین ان کے شاعر کا نام بھی ضرور لکھا ہے ۔ اس مین چند اشعار صہبائی سے بھی منسوب کرکے لکھے ہین لیکن یہ تحریر نہین کیا ہے کہ یہ اشعار انھون نے کہان پڑھے یا سنے تھے (غالبا " اس کی انھون نے ضرورت نہین سمجھی تھی) بہرحال وہ چند اشعار ذیل مین درج کئے ہین ۔

مثال صنعت تجرید ۔

آتش غم ایسی کچھ بھڑکی کہ دل مین ہوگیا

داغ دل سے آفتاب روز محشر آشکار

مثال صنعت طباق ۔

دیکھنا مفہ لال ہوجاوینگے کس کس کے ابھی

سامنے میرے جو برگ سبز پان تونے دیا

(یہ شعر ترجمہ حدایق البلاغۃ مین بھی ملتا ہے)

مثال صنعت تقسیم ۔

زلف اس مہوش کے رخ پر دخان ہے آگ پر

اور رخ اس مہرو کا شعلۂ زیر دخان

---

۱ ۔ ہم عصرون پر غالب کا اثر ، ص ۲۵٤ (فوٹ نوٹ)

ہائے یون ہو اس دخان سے تیرہ اپنا روز عش

اور اس شعلے سے یون روشن ہو شام دشمنان

مثال صنعت خیفا ۔

شب کو جشن سرود تخت رہا

کار فیض مدار بخت رہا

مثال صنعت جمع و تقسیم ۔

تجھے اور تیرے دشمن کو بید ہے اوج عالم مین

تجھے تخت خلافت پر ، اسے دار سیاست پر

مثال بحر ہزج مسدس اخرب مقبوس اختر مسبغ ۔

کہتا ہے کہ نہ کھینچ تو آہین

ہین دل سے تیرے تو ہم تلک راہین

بیٹھا وہ رقیب کہ جو پہلو مین

اٹھا یہ درد دل کہ کھینچی آہ

اگرچہ ان اشعار مین شعریت کی کمی محسوس ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اشعار تخئیل یا جذبہ سے مغلوب ہوکر نہین کہے گئے بلکہ "ضرورتاً" کسی صنعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہے گئے ہین ۔ مندرجہ بالا اشعار اگرچہ تعداد مین بہت کم ہین اور ضرورت کے تحت کہے گئے ہین تاہم ان کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ فارسی کے ساتھ اردو مین شعر کہنا ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا ۔ اگر وہ ذرا بھی اس طرف توجہ دیتے اور اردو زبان مین شاعری کرتے تو آج فارسی کے ساتھ ساتھ اردو مین بھی ان کا وہی اعلی مقام ہوتا جو آج فارسی زبان و ادب مین ان کو حاصل ہے ۔ اور ان کا شمار بھی ذواللسانین شعرا مین کیا جاتا جیسے آج مومن ، غالب ، شیفتہ و آزردہ وغیرہ کا کیا جاتا ہے ۔

صہبائی کے علم و فضل کے بارے مین اہل قلم حضرات کی رائین ۔

صہبائی فارسی کے زبردست عالم اور دوسرے علوم و فنون جیسے طب ، معما ، صرف و نحو ، عروض اور قافیہ مین مہارت کامل رکھتے تھے ۔ وہ اپنے عہد کے مشہور شاعر اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ایک اعلی پائے کے انشا پرداز اور ایک باصلاحیت شارح بھی تھے ۔ ان کے علم و فضل اور کمال کے معترف نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ ان کے بعد کے ادیب و شاعر بھی ہین ۔

غالب جیسے خود پسند شاعر بھی جو صہبائی سے حریفانہ چشمک رکھتے تھے وہ بھی ان کو بڑا شاعر تسلیم کرنے پر مجبور تھے ۔ چنانچہ کہتے ہین ۔۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود

باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ

عسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان [1]

اس کے علاوہ اکثر اپنے خطوط مین مفتی آزردہ کے ساتھ صہبائی کا ذکر بھی کرتے ہین اور انہین اپنے مقتدر ہم عصرون مین شمار کرتے ہین ۔

فارسی جاننے والون مین ان کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو ۱۸٤۰ء مین دلی کالج مین فارسی کے استاد کی تقرری کے وقت پیش آیا ۔ مسٹر ٹامسن کے استفسار پر مفتی صدر الدین خان آزردہ کا کہنا " ہمارے شہر مین فارسی کے استاد صرف تین شخص ہین ۔ ایک مرزا نوشہ ، دوسرے حکیم مومن خان ، اور تیسرے امام بخش صہبائی " ان کے علم و فضیلت اور قابلیت پر دلالت کرتا ہے ۔

---

۱ ۔ کلیات غالب ، ص ۹٤ ا

ذیل مین هم ان کے چند هم عصر نیز زمانۂ مابعد کے انشا پردازون کے خیالات اور رائے انهین کے الفاظ مین پیش کررهے هین ۔ تاکه صحیح صحیح اندازه هوسکے که اهل قلم حضرات صهبائی کو ان کو علم و فضل کے اعتبار سے کیا مقام و مرتبه دیتے تھے ۔

۱۔ صهبائی کے هم عصر مولوی کریم الدین لکھتے هین ۔۔

" فارسی مین بڑی زبردست قدرت رکھتے هین ۔ همارے زمانے مین کتب فارسی مین مثل ان کے کوئی ماهر نهین ۰۰۰۰ تمام کتب فارسیه پر عبور هے "۔[۱]

۲۔ موسیو گارسان دتاسی کهتے هین ۔۔

" امام بخش صهبائی پروفیسر دهلی کالج هین ۔ یه فارسی کے بهت بڑے استاد مانے جاتے هین ۰۰۰ "۔[۲]

۳۔ سرسید ان کا شمار نامور اساتذۂ دهلی مین کرتے هین ۔ اپنی مشهور زمانه تصنیف آثارالصنادید مین صهبائی کے علم و فضل کا ذکر ان الفاظ مین کرتے هین ۔

" اس جزو زمان مین ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا هے اور طرفه یه هے که فنون متعارفۂ سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیه و استکمال فن معما وغیرها مین ایسا کمال بهم پهنچایا هے که هر فن مین یك فنی کهنا چاهئے ۰۰۰ "۔[۳]

٤۔ نواب صدیق حسن خان کی رائے صهبائی کے بارے مین مندرجه ذیل الفاظ مین ملتی هے ۔

۱۔ طبقات الشعرائے هند ، ص ۴۱۳
۲۔ خطبات گارسان دتاسی ، (پانچوان خطبه) ص ۹٤
۳۔ آثارالصنادید ، ص ۶۳۱

" صہبائی مولوی امام بخش دہلوی ، ساغر کش مطبخہ سخندانی و پیر مغان میکدہ معانی است۔ در فنون علوم رسمی پایہ بلند داشت و در فارسی دانی و ۰۰۰۰ مہارت در س کتب این زبان منصب ارجمند ، در وقت خود ش در دہلی بی نظیر زمان می زیست و نزد اکابر و امرائے دارالخلافہ بعزت و اکرام بسر می برد ۰۰۰ "۔[1]

۵۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی لکھتے ہین ــــ

" مولانا صہبائی ۰۰۰۰ کی علمیت کا ڈنکا تمام ہند وستان مین بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمالات آدمی کہان پیدا ہوتے ہین۔ ہزارون شاگرد ہین جو اکثر ریختہ کہتے ہین اور یہ ان کو اصلاح دیتے ہین مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے ۰۰۰ "۔[2]

۶۔ ڈاکٹر مولوی عبد الحق کہتے ہین ــــ

" مولوی امام بخش صہبائی مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے ۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابین نصاب تعلیم مین داخل تھین۔ ان کی تصانیف اب تک پڑھی جاتی ہین شہر مین ان کی بڑی عزت تھی ۔ علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی ۰۰۰۰ "۔[3]

۷۔ شبلی اپنے مضمون " سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر " مین صہبائی کو سرسید کی سوسائٹی کا ایک بڑا رکن تسلیم کرتے ہین۔ ان کا بیان ہے ــــ

۱۔ شمع انجمن ، ص ۲۶۲
۲۔ دلی کی آخری شمع ، ص ۷۹
۳۔ مرحوم دہلی کالج ، ص ۵۲ ا

" سرسید کی جس زمانے مین نشوونما ہوئی دلی مین اہل کمال کا مجمع تھا اور امرا اور روٴسا سے لے کر ادنی طبقے تک مین علمی مذاق پھیلا ہوتا تھا ۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدر الدین خان آزردہ ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے ۔ ان مین سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا ..."[1]

۸۔ قاضی عبد الودود اردو کے مشہور محقق اور ادیب صہبائی کا شمار ہندوستان کے مشہور فارسی دانون مین کرتے تھے اور فارسی دانی مین ان کا مرتبہ غالب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون مین لکھتے ہین ۔۔

" ہندوستان کے مشہور فارسی دان عبد الرشید ، آرزو ، وارستہ ، بہار ، قتیل اور صہبائی جو ان کے (غالب) طعن و طنز کے زہر آلود تیرون کی آماجگاہ رہے ہین فارسی دانی مین ان سے بہ مراتب بہتر تھے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ادبی حیثیت سے وہ غالب کے مقابل نہین ..."[2]

۹۔ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے مترجم مرزا محمد عسکری لکھتے ہین ۔۔۔

" صہبائی بہت روشن خیال اور اخلاقی جرٴت کے آدمی تھے ۔ زبان فارسی مین ان کو کمال حاصل تھا اور اس زمانہ مین جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا ایک خاص عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ فن شعر مین استاد مشہور تھے ۔ قلعہ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے ..."[3]

۱۔ مقالات شبلی ، جلد دوم ، ص ۵۷
۲۔ غالب بحیثیت محقق ، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) ص ۴۹۔۱۹۴۸ء ، ص ۱۷۲
۳۔ تاریخ ادب اردو ، حصہ نثر ، ص ۸۰

۱۰۔ پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہین ــــ

" امام بخش صہبائی ۰۰۰۰ فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے۔ فارسی کے بعض ادق کتب درسیہ ۰۰۰۰ کی شرحین بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی مین لکھی ہین ۰۰۰۰"۔[۱]

۱۱۔ ظہیر احمد صدیقی کہتے ہین ــــ

" جن کتابون کی مولانا نے شرحین لکھی ہین وہ اپنی مشکل پسندی اور فلسفیانہ گہرائی کی وجہ سے ایسی ہین کہ دوسرے کا قلم اٹھانا مشکل ہے۔ مگر مولانا نے ان کو پانی کرکے رکھ دیا ہے"۔[۲]

۱۲۔ پروفیسر سمیع الدین احمد اپنے مضمون مین لکھتے ہین ۔

" ان کی شخصیت بہت متنوع اور ہمہ گیر تھی ۔ وہ بہ یک وقت ایک قادر الکلام شاعر ، صاحب طرز انشا پرداز ، دقیقہ رس شارح اور فنون شعر کے رمز شناس عالم تھے۔ وہ ادیب بھی تھے اور محقق بھی ۰۰"۔[۳]

۱۳۔ ظفر ادیب لکھتے ہین ــــ

" صہبائی کی خوئے پسندیدہ کا اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جامع صفات ہونے کے باوجود منکسرالمزاج تھے ۰۰۰۰ وہ ان سب ہی خصوصیات و صفات کے حامل تھے جو نجیب الطرفین مین پائی جاتی ہین ۰۰"۔[۴]

۱۔ داستان تاریخ اردو ، ص ۲۰۰

۲۔ مولانا صہبائی کا انتخاب دواوین ، غالب نامہ ، جولائی ۱۹۸۱ء ص ۱۶۰

۳۔ صہبائی ، شاعر انشا پرداز اور شارح کی حیثیت سے ، غالب نامہ ، جنوری ۱۹۸۴ء ، ص ۸۰

۴۔ ہم عصرون پر غالب کا اثر ، ص ۲۵۱ ، ۲۵۲

فهرست منابع

فہرست منابع

۱۔ آثارالصنادید ۔ سرسید احمد خان ۔ نولکشور لکھنئو ، ۱۸۹۵ء

۲۔ آئینۂ اکبری ۔ ابوالفضل ، بتصحیح سید احمد خان ،

۳۔ آزرده ، صدرالدین ۔ مختارالدین احمد ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۷۴ء

۴۔ امام بخش صہبائی ۔ خواجہ محمد حامد ۔ بزم غالب ، کامٹی مہاراشٹرا ، ۱۹۸۲ء

۵۔ انتخاب دواوین ۔ امام بخش صہبائی ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، دہلی ۱۹۸۷ء

۶۔ بحرالفصاحت ۔ حکیم نجم الغنی رامپوری ۔ مطبع نولکشور لکھنئو ، ۱۹۸۲ء

۷۔ بزم تیموریہ (جلد اول و دوم) صباح الدین عبدالرحمن ، معارف اعظم گڑھ ، ۱۹۸۱ء

۸۔ تحقیقی مطالعے ۔ ڈاکٹر نذیر احمد ، لکھنئو یونیورسٹی ۱۹۵۴ء

۹۔ تاریخ ادبیات ایران ۔ رضازادہ شفق ، (ترجمہ نیو لیتھو آرٹ پریس ۱۹۸۵ء

۱۰۔ تاریخ ادب اردو ۔ (جلد دوم حصہ اول) ۔ جمیل جالبی ، دہلی ۱۹۸۴ء

۱۱۔ تاریخ ادب اردو ۔ حصہ نثر ، مترجم مرزا محمد عسکری ، نولکشور لکھنئو ۱۹۳۹ء

۱۲۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک ۔ علی رضا نقوی ،

۱۳۔ تذکرۂ سخن شعرا ۔ عبدالغفور نساخ ، مطبع نولکشور ، لکھنئو ۱۸۷۴ء

۱۴۔ تذکرہ سرو آزاد ۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ، لاہور پنجاب ، ۱۹۱۳ء

۱۵۔ تذکرہ خزانۂ عامرہ ۔ میر غلام علی آزاد ، منشی نولکشور ، کانپور

۱۶۔ تذکرۂ سفینۂ خوشگو ۔ بندرا بندداس خوشگو ، رمنا روڈ پٹنہ ۔ ۱۹۵۵ء

۱۷۔ تذکرہ نتائج الافکار ۔ محمد قدرت اللہ گوپاموی ، چاپخانہ سلطانی ، بمبئی ۔ ۱۳۳۶ھ

۱۸۔ تذکرۂ اہل دہلی ۔ سید احمد خان ، مرتبہ قاضی احمد میان جوناگڑھی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۵ء

۱۹ـ جواهر الحروف ـ ٹیک چند بہار ، مطبع محمدی ، کانپور ، ۱۸۵۱ء

۲۰ـ حیات جاوید ـ الطاف حسین حالی ، ادنامی پریس ، کانپور ، ۱۹۰۱ء

۲۱ـ حدایق البلاغت ـ ترجمہ امام بخش صہبائی ، مطبع منشی نولکشور لکھنئو ، ۱۸۴۲ء

۲۲ـ خطبات گارساں دتاسی ـ مترجمہ و شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ، ۱۹۳۵ء

۲۳ـ خمخانۂ جاوید ـ جلد اول ، چہارم ، پنجم ـ لالہ سری رام سہائے ـ ۱۳۲۵ھ

۲۴ـ دیوان صہبائی ـ مخطوطہ ـ منیر عالم کلیکشن ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ـ

۲۵ـ دیوان بیدل مع نکات ـ مرزا بیدل ـ منشی نولکشور کانپور ۱۳۰۳ھ

۲۶ـ دیوان قدسی ـ بوستان العاشقین ـ

۲۷ـ دستور الفصاحت ـ حکیم سید احمد علی خان یکتا ـ (بتصحیح امتیاز علی خان عرشی) ۱۹۷۳ء

۲۸ـ دلی کی آخری شمع ـ مرزا فرحت اللہ بیگ ـ دلی پرنٹنگ ورکس ، دہلی ۱۹۴۰ء

۲۹ـ داستان تاریخ اردو ـ پروفیسر حامد حسن قادری ، مطبوعہ آگرہ ، ۱۹۴۱ء

۳۰ـ دکن کے بہمنی سلاطین ـ ہارون خان شیروانی ، مترجم رحم علی الہاشمی ، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی ،

۳۱ـ رقعات بیدل ـ مرزا بیدل ـ منشی نولکشور ، ۱۸۹۲ء

۳۲ـ رسالہ حسن و عشق ـ نعمت خان عالی ـ

۳۳ـ سہ نثر ظہوری ، نورالدین ظہوری ـ

۳۴ـ سرزمین ہند ـ علی اصغر حکمت ـ انتشارات دانشگاہ تہران ۱۳۳۷ شمسی

۳۵ـ سرکشیٔ ضلع بجنور ـ سید احمد خان ـ مرتبہ سید معین الحق ـ سلمان اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء

۳۶ـ سبک شناسی ـ جلد سوم ـ ملک الشعرا بہار ، چاپ تابان ـ

۳۷ـ شبنم شاداب ـ ظہیر الدین ظہیر تفرشی ـ بتصحیح محمد نعیم الرحمن ـ کتابستان الہ آباد ۱۹۳۵ء

۳۸۔ شعرالعجم جلد سوم و پنجم ۔ مولانا شبلی نعمانی ۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

۳۹۔ شمع انجمن ۔ نواب صدیق حسن خان ۔ مطبع شاهجهانی ، ۲۹۳ ا ھ

۴۰۔ صہبائی ۔ محمد انصار اللہ ، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۔ ۱۹۸۶ء

۴۱۔ طبقات الشعرائے ہند ۔ ایف فلن و مولوی کریم الدین ، دائرہ ادب پٹنہ ۔ ۱۹۶۴ء

۴۲۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی ۔ محمد میان ، مکتبہ برہان ، دہلی ۱۹۶۳ء

۴۳۔ عود ہندی ۔ مرتبہ چودھری عبد الغفور سرور ، بتصحیح امیر حسن نورانی ۔ نولکشور لکھنئو

۴۴۔ غدر کے چند علما ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ۔ نیا کتاب گھر دہلی ۔

۴۵۔ غالب ۔ غلام رسول مہر ۔ مبارک علی ناشر لاہور ۱۹۶۵ء

۴۶۔ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب ۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری ۔ انڈو پرشین سوسائٹی ، کوہ نور پریس دہلی ، ۱۹۶۹ء

۴۷۔ کلیات صہبائی ۔ جلد اول ۔ امام بخش صہبائی ۔ مرتبہ منشی دین دیال ، مطبع نظامی کانپور ، ۱۸۷۸ء

۴۹۔ کلیات صہبائی ۔ جلد دوم ۔ حصہ اول ، امام بخش صہبائی ، مطبع نولکشور لکھنئو ۱۸۸۰ء

۵۰۔ کلیات صہبائی ۔ جلد دوم حصہ دوم ۔ امام بخش صہبائی ، مطبع نولکشور لکھنئو ۱۸۸۰ء

۵۱۔ کلیات غالب ۔ حصہ نظم فارسی ۔ مرتبہ امیر حسن نورانی ، مطبع منشی نولکشور ۱۹۶۸ء

۵۲۔ گلستان سخن ۔ مرزا قادر بخش قادر ، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

۵۳۔ گل رعنا ۔ حکیم سید عبد الحئی ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔ ۳۵۳ ا ھ

۵۴۔ گلشن بیخار ۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ ۔ نولکشور ۔ لکھنؤ ۔ ۱۹۱۰ء

۵۵۔ مقالات شبلی ۔ جلد دوم ، مولانا شیبی نعمانی مطبع معارف اعظم گڑھ ۔ ۱۹۳۱ء

۵۶۔ مینا بازار ۔ ظہور ترشیزی ، مطبع نولکشور ، ۲۸۵ ا ھ

۵۷۔ مآثر عالمگیری ۔ مستعد خان ، ۱۸۷۱ء

۵۸۔ مقدمات ظہوری ۔ عبد الرزاق سورتی ۔ مطبع نولکشور ، لکھنئو (بار چہارم) ۱۹۲۴ء

۵۹ـ مرحوم دهلی کالج ـ مولوی عبدالحق ـ انجمن ترقی اردو (هند) دهلی ۱۹۴۵ء

۶۰ـ مسالک و منازل ـ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ـ مکتبه جامعه دهلی ۱۹۷۵ء

۶۱ـ ۱۸۵۷ء کے مجاهد شعرا ـ مولانا امداد صابری ـ

۶۲ـ مرزا بیدل ـ پروفیسر نبی هادی ـ اسرار کریمی پریس الهآباد ۱۹۸۲ء

۶۳ـ نگارستان فارس ـ مولوی محمد حسین آزاد کریمی پریس لاهور ـ ۱۹۲۲ء

۶۴ـ نکات الشعرا ـ میر تقی میر ـ مرتبه حبیب الرحمن خان شروانی ـ انجمن ترقی اردو نظامی پریس،

۶۵ـ هم عصرون پر غالب کا اثر ـ ظفر ادیب ـ قصر اردو دهلی ـ ۱۹۷۱ء

۶۶ـ یادگار غالب ـ حصه فارسی ـ خواجه الطاف حسین حالی ـ مکتبه جامعه دهلی

67- Dreams Forgotten-- Prof. Faris Firmani, Aligarh Muslim University, Aligarh.

68- India through the ages--Sir Jadu Nath Sarkar.

69. Zuhuri - Life and works --Dr. Nazir Ahmad, Allahabad, 1953.

رسائل و میگزین

۱ــ مضمون نگاری ، علامه اخلاق د هلوی ،

۲ــ علی‌گڑھ میگزین ، غالب نمبر ، ۴۹ـ۱۹۴۸ء

۳ــ معارف ، د سمبر ۱۹۷۶ء ــ ، اپریل ۱۹۷۸ء ، اپریل ۱۹۸۷ء ، نومبر ۱۹۵۴ء ، د سمبر ۱۹۵۴ء ــ

۴ــ غالب نامه ــ جولائی ۱۹۸۱ء ــ جولائی ۱۹۸۴ء

فہرست مخطوطات ــ

۱ــ فہرست نسخه های خطی ــ سید عارف نوشاهی ، موزه ملی پاکستان کراچی

۲ــ فہرست مخطوطات فارسی جلد اول و د وم ، برٹش میوزیم آکسفورڈ ۱۹۶۶ء

۳ــ فہرست مخطوطات عربی و فارسی ــ مولوی عبد المقتدر خان اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنه ــ

۱ــ جلد اول ۱۹۰۸ء
۲ــ جلد د وم ۱۹۱۰ء
۳ــ جلد سوم ۱۹۱۲ء

۴ــ فہرست مخطوطات فارسی ترکی ، هند وستانی ، پشتو ــ هرمن ایتھے ــ بوڈ لین لائبریری آکسفورڈ ۱۸۸۹ء

۵ــ فہرست منیر عالم کلیکشن ، مولانا آزاد لائبریری علی‌گڑھ

۶ــ فہرست حبیب گنج کلیکشن ، مولانا آزاد لائبریری علی‌گڑھ